# جناب

محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو، لاہور

# جناب

محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو، لاہور

بار چہارم
تعداد
طابع
ناشر    اِدارہ فروغِ اُردو، لاہور

اُن لکھنے والوں کے نام

جو میری ہی طرح، اپنے آپ کو ادیب سمجھتے ہیں

# ترتیب



بسم اللہ

شخصی مطالعے قربت اور دُوری کی وجہ سے، دُھندلے اور روشن ہوتے ہیں جتنی قربت ہوگی۔ اتنی ہی تصویر دُھندلی بنے گی جتنا فاصلہ ہوگا۔ اُتنی ہی واضح تصویر بنے گی۔

یہ کلیہ ہر معاملے میں ساتھ نہیں دیتا۔ مگر پیشِ نظر کوئی شخصیت ہو تو پھر یونہی ہوگا۔

یوں سوچیں کہ ایک قدآور شخصیت کے سامنے ایک بونا کھڑا ہے وہ اگر کسی کو سر سے پیر تک جانچنا بھی چاہے گا تو کیسے جانچے گا؛ فاصلہ ضروری ہوا نا!

اگر شخصیت اور شخصیت نگار دونوں ہی قدآور ہوں گے۔ تو پھر بیچاری شخصیت دم توڑ دے گی۔ شخصیت نگار اُسے پچھاڑ دے گا

میں ایک بونا ہوں۔

محمد طفیل

# مولوی عبدالحق

آپ بابائے اُردو کے بارے میں نمبر نکال رہے ہیں۔ ضرور نکالیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ بابائے اُردو پر کام کا مضمون لکھنے والے آپ کو ملیں گے کہاں؟ یہی بات سوچتا ہوں تو میرا بھی قلم تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ سوچئے تو اُس شخصیت پر مضمون لکھنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ جس نے بڑے بڑوں کو قلم پکڑنا سکھا دیا ہو۔

مولوی صاحب آدمی نہیں، دیوانے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ زندگی جیسی عزیز چیز، صرف اُردو کے لیے بِتا دی۔ جب سے مجھے مولوی صاحب کی اِس بُری عادت کا پتہ چلا ہے۔ میں ان سے دُور رہنے لگا ہوں۔ تاکہ یہ مہلک بیماری کہیں مجھ سے بھی چپک نہ جائے ___ مگر ایسا دیوانہ تو پونے دو سو برس میں ایک ہی

---

* اُردو کالج کراچی کا مجلہ "برگِ گل" مولوی صاحب کے نوّے سالہ جشن پر ایک نمبر نکال رہا تھا۔ یہ مضمون اسی کے لیے لکھا گیا تھا۔

پیدا ہوا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میرا مولوی صاحب سے کوئی یارانہ نہیں۔ وہ بوڑھے ہیں جوان، وہ ہاپڑ کے، میں پنجاب کا، وہ عالم، میں "محمد فاضل"— قربت بھی نصیب نہ ہوئی جو اوروں کی طرح جھوٹی سچی باتیں لکھ ڈالوں، دو چار دفعہ کی ملاقات، تھوڑی سی خط و کتابت، بس یہ مختصر پونجی

میری ایک بُری عادت یہ ہے کہ میں ہمیشہ اونچے ہاتھ مارتا ہوں مثلاً اپنے زمانہ ادارت کے پہلے ہی دن سے میں نے یہ چاہا کہ سوائے خدا تعالیٰ کے دنیا کے ہر بڑے مصنف کی چیز میرے پرچے میں چھپے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جان نہ پہچان، بڑی بی سلام کے مصداق، مولوی صاحب کو بھی "گرامی نامہ" لکھ ڈالا۔ عرض کیا۔ بندہ نقوش کا ایڈیٹر ہو گیا ہے۔ اس لیے آپ کا بھی مضمون اس پرچے میں چھپنا چاہیے — میں نے سوچا تھا۔ جہاں سینکڑوں ادیبوں کو خط لکھے ہیں۔ وہاں ایک اور سہی۔

بیشتر ادیب میرے خط کا جواب پی گئے۔ مگر مولوی صاحب کا جواب آیا۔ مضمون نہ ملا مگر جواب ملا۔ میری ہمت بندھائی، لگن سے کام کرنے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی وعدہ کیا۔ کوشش کروں گا کہ "کبھی کوئی مضمون بھی بھیج دوں"۔ پہلے ہی مرحلے پر میں نے مولوی صاحب کو مردِ معقول تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد جب بھی ان سے کچھ پوچھا، انھوں نے بڑے پیار اور بڑی

محبت سے وہ بات سمجھائی بھی سمجھائی بھی، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی خط لکھا ہو اور اس کا جواب نہ آیا ہو۔ اب جا کر یہ ہوا ہے کہ دو چار خطوں کے جواب نہیں آئے۔ ویسے اُن میں کوئی جواب طلب بات بھی نہ تھی۔ صرف میں نے خیریت پوچھی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ ایسے فضول خطوں کے جواب نہ دیتے ہوں۔ دوسرے میں نے یہ بھی سُن رکھا ہے کہ مولوی صاحب کانوں کے بڑے کچے ہیں۔ عین ممکن ہے۔ کسی بھلے مانس نے کان بھر دیئے ہوں اور انھوں نے سمجھ لیا ہو ——— "اچھا یہ بات ہے" ——— ویسے مولوی صاحب بڑے صاف گو بزرگ ہیں۔ دل میں کوئی بات نہیں رکھتے۔ کسی سے ڈرتے نہیں (میرا خیال ہے کہ اللہ میاں سے بھی برائے نام ہی ڈرتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب بھی ملاقات ہوئی یہ ضرور پوچھوں گا ——— مولوی صاحب میری تقصیر؟

مولوی صاحب جیسا حوصلہ اور کسی کا نہ ہوگا۔ یہ اپنے خوردوں کی اتنی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ اپنی ذات تک کو ثانوی حیثیت دے ڈالتے ہیں۔ یہ ایسی باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں کہ چند منٹ ساتھ گذار لیجئے۔ مدتوں بھول نہ پائیں گے۔ خط بھی مزے کے لکھتے ہیں۔ انداز دیکھئے:

مکرمی محمد نقوش صاحب سلمہٗ

"آپ نے مجھے نقوش کا آخری نمبر عنایت فرمایا تھا۔

میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا اور ہاتھ لگتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اتنا
ضخیم اور حجیم رسالہ کیا پورا توپ خانہ ہے۔ پھر مختلف اور متنوع
مضامین سے بھرپور لکھنے والوں میں ایک سے ایک بڑھیا۔ باوجود
ان تمام خوبیوں کے مجھے کبھی پورا پڑھنا نصیب نہ ہوتا۔ جب
باوجود شوق کے پورا نہیں پڑھ سکتا تو حیرت ہے کہ آپ اتنے
سارے اور اتنے اچھے مضمون کیونکر لکھواتے اور انہیں مرتب
کرتے اور چھاپتے ہیں اور شائع کرتے ہیں اور اس زمانے میں
جب کہ ہر شے کی گرانی کے ساتھ کاغذ بھی گراں ہو گیا ہے۔

آپ کو اپنے صاحبزادہ نقوش سلمہٗ کی پانچویں سالگرہ
مبارک ہو۔ یہ ایسا خوبصورت ہونہار موٹا تازہ گبدو سا ہے کہ
دیکھے سے نظر لگتی ہے۔ خدا اسے نظر بد سے اور مجھے آپ کے
تقاضوں سے بچائے۔

خیر طلب عبدالحق

قطع نظر اس کے کہ اس خط میں میری تعریف کے پہلو میں (فی الحال
تعریف والے پہلو کو گولی ماریئے) آپ اس خط کو صرف خط کی حیثیت سے
دیکھیں۔ کتنی ندرت ہے اس میں، کتنا بانکپن ہے اس میں، بھلا ایسے شگفتہ اور

---

ــــہ نقوش شمارہ نمبر ۳۱، ۲۲

دلآویز خط کا ہے کہ کوئی لکھ سکے گا۔

لگے ہاتھوں ایک اور خط بھی پڑھ لیجئے۔ تاکہ انہی کی وجہ سے میری یہ دو چار سطریں بھی گوارا ہو جائیں :۔

تسلیم! آپ کی شکایت بجا کہ میں نے آپ کے نئے رسالے پر اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ یہ پوٹ کی پوٹ اکٹھے سات سو صفحے، خدا کی پناہ! اسے رسالہ کون کم بخت کہتا ہے۔ یہ تو ابوالرسائل ہے اس پر اظہار رائے آسان نہیں۔ اتنی ساری شخصیتیں اور ان پر لکھنے والوں کی شخصیتیں اور پھر ان پر لکھنے والوں کی تنقیدیں اور ان پر مقالے ایک طومار ہے۔ یہ نمبر در حقیقت قاموس شخصیات ہے۔ جو مدتوں یادگار رہے گا اور لوگ حوالے اور استناد کے لیے اسے ڈھونڈھا کریں گے۔

آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں۔ مگر تازہ شخصیات نمبر سب پر بازی لے گیا۔

اب صرف ایک شخصیت رہ گئی ہے۔ جو عجیب و غریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا۔ کئی ہوں گے۔ عجب نہیں کسی روز پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔ عبدالحق

---

ے نقوش شمارہ نمبر ۴۹ ، ۵۰

ان حصوں میں کوئی نہ کوئی مزہ لینے والی بات ضرور ہے۔ وہ بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ۔ اس حد تک دوسروں کی حوصلہ افزائی کا جذبہ؟ (خدا میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میرے اور میرے کام کے بارے میں مولوی صاحب اتنی عمدہ رائے رکھتے) یہ بھی مولوی صاحب کا حصّہ ہے۔ جو اتنے ہی بڑے کر دار کے لوگوں میں ملے گا۔

میرے پاس مولوی صاحب کے کئی خط ہیں۔ مگر میں نے سنبھال کر نہیں رکھے۔ ضائع بھی نہیں کیے۔ بس اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ فرصت ہوتی تو انھیں اس موقع پر ضرور یکجا کر دیتا۔ مگر اس فرہاد کو بھی شیریں (نقوش کے) عشق سے فرصت نہیں ـــــ دوسرے "دوستوں" کو بھی دو خط ہضم ہو جائیں تو بھی غنیمت!

۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ میں نے نقوش کی پنجسالہ زندگی کے وقت سوچا تھا کہ لاہور میں بہت بڑے پیمانے پر کانفرنس کر ڈالی جائے۔ مولوی صاحب کو صدارت کے لیے لکھا۔ بے تکلف راضی ہوئے۔ رشید احمد صدیقی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کو بھی لکھا کہ ذرا آجائیے۔ سارا پروگرام طے تھا۔ احباب پا بہ رکاب تھے کہ کانفرنس سے دو ہی چار دن پہلے قادیانی ایجی ٹیشن کے سلسلے میں، لاہور میں مارشل لا لگ گیا۔ سارا کیا دھرا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے خط لکھا: "اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ لاہور میں مارشل لا

لگ گیا۔ ورنہ آپ کہاں ماننے والے تھے۔ ضرور میرا مُربّہ بنا لیتے (اُن دنوں لاہور میں قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی)

اُس وقت تک مولوی صاحب کو دیکھنے کی سعادت نصیب نہ تھی۔ اچانک کسی کام کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے۔ مدرسۃ البنات کی بلڈنگ میں ٹھہرے۔ یہ ناچیز بھی زیارت کے لیے پہنچا۔

جس وقت میں پہنچا۔ اس وقت مولوی صاحب کھانا کھا رہے تھے تین اور صاحب تھے۔ چوتھے مولوی صاحب تھے۔ کھانے کے بعد ایک صاحب نے مالٹا پیش کیا اور کہا" یہ بڑا مزے دار ہے"

مولوی صاحب نے کہا" آپ نے بغیر کھائے یہ کیسے فیصلہ کر لیا؟

"اس کی صورت اچھی ہے"

"بعض حرام صورت بھی ہوتے ہیں"

کھانے کے دوران میں انھوں نے کہا۔" کراچی میں تو مَیں صرف پھل کھاتا ہوں۔ اس لیے کہ یہی کھانے کی چیز ہے۔ یہاں جب کھانا سامنے آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ اور جب کھانے بیٹھتا ہوں تو مجھے اپنے اوپر حیرت ہوتی ہے کہ میں اتنا کھا گیا۔ کراچی میں تو بھوک قطعاً نہیں لگتی (پھر ہنس کر)" یہاں تو بھوک ہی بھوک ہے"

کھانے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ میرے ساتھی نے تعارف

کرایا۔ "آپ طفیل صاحب ہیں؟"

"خوب خوب بڑی خوشی ہوئی" نقوش کا نمبر پیش کیا تو دیکھتے ہی کہنے لگے۔ نقوش کو دیکھ کر درود شریف پڑھنے کو جی چاہتا ہے"۔۔۔ پھر نقوش کے اوراق پلٹے۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالی تو ۔۔۔ "اللّٰھم صلّ علی" پڑھنے لگے۔

اس کے بعد میرے ساتھی نے پوچھا "آج پریس کانفرنس تھی۔ اس میں کیا کیا سوالات پوچھے گئے؟" مولوی صاحب نے کہا "کوئی خاص بات تو پوچھی نہیں گئی۔ البتہ ایک صاحب نے پوچھا تھا کہ پنجابی کے بارے میں آپ کا کیسا خیال ہے؟ اس پر میں نے ہنس کے کہہ دیا ۔۔۔ اتنے پنجابیوں کے سامنے کچھ کہنا آسان تھوڑی ہے"۔

پھر بنگال میں اُردو کا تذکرہ چل نکلا۔ کہنے لگے۔ "وہاں تو وہی بات ہوئی جو میاں مولانا اختر علی خان کے ساتھ ہوئی کہ سوچا کچھ تھا اور ہوا کچھ! (اُن دنوں پنجاب میں احمدیوں کے خلاف زمیندار نے خوب زور شور سے پراپیگنڈا شروع کر رکھا تھا گورنمنٹ نے ایک برس کے لیے پرچہ بند کر دیا) یعنی گرے بھی تو شنوائی نہ ہوئی اور بعد میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے گرفتار بھی ہو گئے ۔۔۔ بابا گرفتار ہونا تھا تو معافی کیوں مانگی تھی ۔۔۔ ہائے ہائے بوڑھے باپ کو بھی (اپنی صفائی کی خاطر) مسجد وزیر خاں میں گھسیٹ کر لے گئے"۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا "بنگال میں تو اُردو کی اتنی شدید مخالفت

ہو رہی ہے کہ سید سلیمان ندوی تک کو تحریری معافی مانگنی پڑی ۔ ورنہ وہاں کے لوگ تو بڑے ہی برہم تھے۔ ممکن ہے سید صاحب کو تحریری معافی اس لیے مانگنی پڑی ہو کہ انھیں تو اپنی جان تک بچانی مشکل ہو گئی تھی"۔

اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ "یہ تو بڑی سستی اور عظیم الشان قسم کی شہادت تھی ۔ میں ہوتا تو شہادت ہی کو قبول کرتا"۔

کچھ عرصے کے بعد میں مکاتیب نمبر کے سلسلے میں کراچی گیا تو مولوی صاحب سے بھی ملا ۔ یہ اپنی لائبریری میں بیٹھے تھے۔ پہچان نہ سکے ۔ تعارف کرایا تو لپٹ گئے ۔ میں نے عرض کیا"۔ خطوط اکٹھے کر رہا ہوں اور مارا مارا پھر رہا ہوں ۔ آپ کے پاس بھی بے شمار خط ہوں گے ۔ وہ دیجیے"۔

کہنے لگے "دلی میں میرا کتب خانہ اور انجمن کا دفتر جل گیا تھا۔ بیشمار قیمتی چیزیں ضائع ہو گئیں ۔ اگر آپ اُن دنوں کہتے تو بیشمار خط دیتا ۔ اب تو میں خود بیتے دنوں کا مرثیہ ہوں"۔

ڈھیٹ بن کر میں نے پھر کہا "کچھ نہ کچھ تو یہاں بھی ہوں گے"۔ کہنے لگے ہاں کچھ نہ کچھ تو ہیں ۔ مگر مولوی آفتاب ( اردو کالج کے سابق پرنسپل) نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے ۔ حتیٰ کہ میری بوڑھی ہڈیوں تک کو پیس ڈالا ۔ اب ایسی باتیں یاد نہ دلاؤ چپکے سے لاہور چلے جاؤ اور میری بدبختی کے دن کٹنے کی دعا کرو ۔ پھر میں تمھاری خدمت ضرور کروں گا"۔

آخری ملاقات لاہور ہی میں ہوئی ۔ جب وہ اورینٹل کالج کی طرف سے

منعقد کی جانے والی اُردو کانفرنس کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ لاہور سٹیشن پہنچے تو ضعیف العمری کی وجہ سے، انھیں کرسی پر بٹھا کر اسٹیشن سے باہر لے جایا گیا۔ مگر کانفرنس میں جب خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک گھنٹے تک پڑھتے رہے۔ لہجہ میں طنطنہ، مطالبے میں شدّت اور پھر وہی حکومت کی ناعاقبت اندیشی کا رونا ــــ یہ سب کچھ صرف مولوی صاحب ہی کہہ سکتے تھے۔ وہ بھی گورنر کی صدارت میں!

شخصیات نمبر کی ترتیب کے وقت میں نے طے کر لیا تھا کہ مولوی صاحب سے ایک آدھ مضمون ضرور لکھواؤں گا۔ اس لیے کہ موصوف شخصیت نگار کی حیثیت سے بھی نمایاں ہیں۔ میں نے خط لکھا۔ طرح دے گئے "بڈھا ہوں۔ مرنے کے دن گن رہا ہوں۔ اس لیے مضمون کیسے لکھوں؟" ــــ یہ بات ٹھیک ہے کہ مولوی صاحب عمر کے اعتبار سے بوڑھے ضرور ہیں۔ مگر جوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ ہر کام وقتِ مقررہ پر کرتے ہیں۔ اگر ایک وقت سیر کا ہے تو ایک وقت ناشتے کا ہے ــــ اسی طرح کھانے کا، پڑھنے کا، لکھنے کا، سونے کا۔

میں نے مضمون کے لیے اصرار کیا۔ یہ بھی میرے کانوں میں پڑ چکا تھا ــــ کہ مولوی صاحب متعصب ہیں۔ وہ پنجابیوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ میں نے تڑا تڑ کچھ اس قسم کے فقرے لکھ ڈالے:

"آپ نے میری ہر مرحلہ پر تعریف کی۔ میرے ہر کام کو سراہا۔ مگر میں مضمون مانگتا ہوں تو آپ پہلو تہی کرتے ہیں۔ بقول آپ کے مجھ میں بڑی خوبیاں ہیں۔ مگر شاید

ایک خرابی ہے ـــــ وہ یہ کہ میں پنجابی ہوں۔"

میرا یہ خط پہنچنا تھا کہ مولوی صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ فوراً خط لکھا۔ "آپ نے مجھے یہ طعنہ دے کر کہ میں پنجابیوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ بڑا دکھ پہنچایا ہے۔ بلکہ میرے لیے اس سے بڑی اور مہذب گالی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب تو آپ کے لیے ضرور مضمون لکھنا ہو گا۔ چند دن انتظار کر لیجیے۔"

مولوی صاحب کی ذات سے، مجھے تو محبت اس لیے ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں، ان جیسا دیوانہ ایک بھی نہیں!

# پطرس بخاری

پطرس نے جب بھی لکھا، لفظوں کے تاج محل بنا ئے۔
پطرس کو جب بھی کسی دوست نے پکارا، لبیک کی آواز آئی۔
پطرس جس بھی راہ سے گزرے، اپنے نقش چھوڑ گئے، اپنے جھنڈے گاڑ گئے۔

اصل میں تو ان تینوں فقروں ہی میں مرحوم کی پوری شخصیت ہے مگر اتنا اختصار بھی کس کام کا، جس میں پیاس باقی رہ جائے۔

بخاری صاحب سے میری یاد اللہ، کوئی زیادہ پرانی نہیں نئی بھی نہیں، اس لیے کہ مرحوم کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا نہیں، سنا تو ہے۔ اگر ملنے ملانے کی حد تک، میں ان کی خدمت میں نو وارد ہوں تو سننے سنانے کی حد تک بیگانہ نہیں۔

جب یہ طالب علم تھے تو انھوں نے "پطرس کے مضامین" لکھی۔

(غالباً ۱۹۲۸ء) جب میں طالب علم تھا، تو میں نے یہ کتاب پڑھی۔ بہ ظاہر ان کا لکھنا اور میرا پڑھنا زمانہ طالب علمی کی داستان ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور بھی ہے۔ جب میں بچہ تھا۔ اُس وقت بھی میں نے اسے پڑھا۔ اب جبکہ بچوں کا باپ ہوں، تو بھی یہ چھوٹی سی کتاب میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہر وقت اُکساتی رہتی ہے۔ مجھے پڑھو، مجھ سے سیکھو، پہلے جو فقرے مجھے ہنسنے ہنسانے پر آمادہ کرتے تھے۔ آج غور و فکر پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بوڑھا ہوں گا تو نہ جانے، یہ کتاب کیا کیا سلوک نہ کرے۔

پطرس کے بارے میں لکھنا آسان نہیں اور اُس جیسا ایک فقرہ لکھنا، قیامت ہی قیامت، میرا خیال ہے جس نے پطرس جیسا ایک بھی فقرہ لکھ لیا، وہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، وہ کم بخت ادیب ضرور ہے۔

جس شخص نے اپنی زندگی میں، جو کچھ بھی لکھا ہو۔ اُس کے ایک ایک لفظ پر غور کر کے لکھا ہو۔ اب کوئی اس کے بارے میں بغیر غور کیے لکھ دے تو یہ زیادتی ہے یا نہیں۔ سچ جانیے، غور کرتا ہوں تو میرے بھی پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ قلم رک جاتا ہے۔ بات آگے نہیں بڑھتی۔ مجبوراً طے کرنا پڑا۔ لکھوں پہلے غور بعد میں کروں۔ جیسا کہ ہمارے ادیبوں کا قاعدہ ہے۔

مرحوم کے جتنے بھی قریبی دوست تھے۔ معلوم ہوتا ہے وہ سب

غور ہی کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ ورنہ کچھ نہ کچھ تو لکھ ہی لیتے۔ اب جس سے عرض کرتا ہوں ـــــ بھائی! اپنے یار پطرس پر کچھ لکھیئے تو ان میں سے ہر ایک یہی جواب دیتا ہے۔ غور کر رہا ہوں ـــــ کچھ عرصے کے بعد دوبارہ عرض کیا۔ غور کر لیا ہو تو کچھ لکھ ڈالیے۔ پھر جواب ملا۔ جتنا غور کرتا ہوں۔ اتنا ہی مشکل ہو رہا ہے۔

یہ جواب مرحوم کے ایک دوست کا نہیں۔ تقریباً سبھی کا ہے ـــ نہ جانے یہ قصور، پطرس کے قابو میں نہ آنے والی شخصیت کا ہے یا مرحوم کے دوستوں کا، اس کا فیصلہ مجھ سے نہ کرائیے۔ اس لیے کہ مجھے آئندہ بھی پرچہ چھاپنا ہے۔

میرا عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً مجھی کو مرحوم کا قریبی دوست بننا پڑا ہے۔ حالانکہ اس بندۂ پُرتقصیر نے مرحوم کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ ان سے خط و کتابت ضرور رہی۔ وہ بھی مختصر، دو تین خط میرے نام آئے تھے اور بس۔

میں نے پچھلے دنوں، رشید احمد صدیقی کا مضمون، مولانا ابوالکلام پر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ مولانا آزاد سے میری صرف چند منٹوں کی ایک ملاقات ہے۔ اور دو خط مولانا کے میرے نام آئے'۔ــــ یہ پڑھ کر میری ڈھارس بندھی۔ سوچا پطرس سے میرا رشتہ اس سے زیادہ کا ہے اس لیے میں کیوں چپ رہوں۔ ضرور گھاس کاٹنی چاہیئے۔

---

لے پطرس نمبر کی ترتیب کے وقت جو مجھے دقتیں پیش آئیں۔ یہ اشارہ اُس طرف ہے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مرحوم ایک ایک لفظ کو کئی کئی طرح سے
سوچتے اور لکھتے تھے۔ تب کہیں جا کہ کوئی خوش قسمت لفظ، ان کے فقرے کی
زینت بنتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا۔ امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک،
صوفی تبسم، حفیظ جالندھری کی محفل جمی ہے۔ گپ شپ ہو رہی ہے۔ لطیفے
تصنیف کیے جا رہے ہیں۔ مگر ان کے دماغ میں وہی لفظ گھوم رہا ہے۔ جس
کے لیے یہ آج پریشان رہے تھے۔ رہا نہ گیا۔ سوال کر دیا۔ چنڈال چوکڑی یہ
بتائے' فقرہ یوں ہے اور ماحول یہ' لہٰذا اس جگہ اس مفہوم میں کون سا لفظ سجے گا؟
کسی نے کہا یہ، کسی نے کہا وہ' انھوں نے کہا۔ سب غلط، بھئی پورے
فقرے کی ساخت پر غور کرو۔ مضمون کے پس منظر پر نظر رکھو۔ کیریکٹر کے مزاج کو
جانچو' پھر بتاؤ' میرے لفظ سے زیادہ موزوں' کوئی لفظ اور ہے؟

مرحوم انگریزی اتنی جانتے تھے - جتنی سارے پاکستانی مل کر جانتے
ہیں اردو جتنی جانتے تھے۔ اتنی اردو کے سارے پروفیسر مل کر بھی نہیں جانتے۔ اگر کسی
پروفیسر کو میرا تبصرہ برا لگے تو وہ مرحوم جیسا ایک جملہ لکھ کر تو دیکھے۔

۱۹۲۸ء کے آس پاس اہلِ پنجاب اور یو۔پی والوں کے درمیان چلی
اور خوب چلی۔ اُدھر سے بھی بڑے بڑے بقراط سامنے آئے۔ اِدھر سے بھی۔
اُدھر والوں کو میں نہیں چھیڑتا۔ ادھر والوں کی بات کرتا ہوں۔

اُس وقت یو۔پی کے کئی رسائل سے پنجابی اہلِ قلم کو مطعون گردانا مگر ان میں قابلِ ذکر علی گڑھ میگزین اور جامعہ تھے۔ اُدھر والوں کا سارا زور، زبان کے اغلاط پر تھا۔ اِدھر والوں میں صلاح مشورے کی حد تک عبدالمجید سالک، ڈاکٹر تاثیر، امتیاز علی تاج تھے۔ مگر جواباً جو کچھ لکھا جاتا تھا۔ اسے لکھتے پطرس ہی تھے[1]۔ بڑے بڑے تیز فقرے اُدھر سے بھی آئے۔ اِدھر سے بھی لوٹائے گئے۔ نیاز مندانِ لاہور کے نام سے پطرس نے لکھا:۔

> اُردو کے تین مرکز ہیں۔ یو۔پی۔ حیدر آباد اور لاہور۔ لیکن اہلِ پنجاب بھی یہ بات گاہے گاہے بھول جاتے ہیں کہ یو۔پی میں یہ زبان خود رو ہے۔ حیدر آباد میں یہ زبان ایک والیٔ مُلک کے سایۂ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے۔ جہاں اس کی نشوونما محض خونِ عشاق کی رہینِ منت ہے۔ جس جگہ یہ زبان خود رو ہے۔ وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھچ کے رہتی ہے۔ لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی سی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضا میں لچک ہے جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔

---

[1] ایک دو مضمون تاثیر نے بھی لکھے تھے۔ جو کہ از نیاز مندانِ لاہور ادب آموز کے نام سے چھپے تھے۔

اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔"

بلکہ اس سے بھی تیز فقرے :۔

"یوپی کے چشمے خشک ہو چکے۔ پیاس بجھانے کے لیے اب وہاں جانا
بے سود ہے۔ اب پنجاب کی رہبری بجز اس کی اپنی قوتِ نامیہ کے
کوئی چیز نہیں کرسکتی۔ یوپی صرف اعتراض کرسکتا ہے۔ رہنمائی نہیں
کرسکتا اور نہیں جانتا کہ اس کا چڑچڑاپن اس کا مربیانہ انداز اس کی
طفلانہ تنقید یہ سب انحطاط کی نشانیاں ہیں۔"

بطرس کے یہ فقرے تیکھے ضرور ہیں۔ مگر دلآزاری کا سلسلہ دونوں طرف تھا۔
بُری بات بھی تو دونوں طرف، اچھی بھی تو دونوں طرف۔ اگر میں جو بات یہاں عرض
کرنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مرحوم کو زندگی کے ہر مرحلہ پر سرداری کا چسکا رہا۔
جب اہلِ پنجاب ہی کے ساتھ لیے جا رہے تھے تو یہ کیسے چُپ رہتے۔

وہ جس بزم میں بیٹھتے تھے۔ چاہتے تھے۔ میری باتیں، میرے جملے حاصلِ بزم
رہیں۔ بزمِ ادب میں بھی انھوں نے اُونچی ہی کرسی پر بیٹھنا چاہا۔ بزمِ سیاست میں بھی
آئے تو ساری دنیا نے ان کی طرف مڑ مڑ کے دیکھا۔ میرا ایمان ہے اگر وہ یوں سرفراز
نہ رہتے تو یقیناً خودکشی کر لیتے، اُن کے مذہب میں، کسی بھی مرحلہ پر سُبکی، موت
کے مترادف تھی۔

مرحوم پہ فقرے وارد بھی بہت تھے۔ خود بھی چلتے تھے۔ مطالعہ بھی ان کا

خوب تھا۔ حافظہ بھی خوب، جو اُن کے مطالعہ کی زد پر آگیا وہ چت، جو ان کی ذہنی اپج کی زد پر آگیا وہ چت، غالباً قدرت نے انھیں ہتھیاری اس لیے تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی فتح کریں، دماغوں کو بھی۔

حصولِ تعلیم کے لیے جب یہ لندن گئے تو انھوں نے تاجؔ صاحب کو کیا عمدہ خط لکھا تھا:۔

"حضرت یہ کیمبرج یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا ہر فرسودہ پتھر تاریخ انگلیس کی ایک خاموش فصل ہے۔ یہ وہ دارالعلوم ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ (جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) اکبر کا کرام ویل (CROM WELL) سٹرن (STERENE) کولرج، سیموئیل ٹیلر، بیکن، ٹینی سن، ٹھیکرے، میکالے، نیوٹن، ہل ورکٹن شیلے، لارڈ چسٹر فیلڈ، مارلو، ولیم پٹ، گرے اور ملٹن کسب فیض کر چکے ہیں۔ اور جہاں اس وقت انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ و بو پھول کیا حقیقت رکھتا ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا ایک غلام قوم کا فرد، نسیم اور مرزا شوقؔ کی مثنویوں کا پڑھنے والا، فسانۂ آزاد کا دلدادہ، طبلے اور سارنگی کا شوقین، زمیندار اور گرد گھنٹال کا خریدار، ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا۔ مغلیہ

عیش و عشرت کا خواہش مند اتحادِ اسلامی کے خواب دیکھنے والا،

میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں"۔

بخاری صاحب جب کیمبرج پہنچے تو ان کے سامنے یونیورسٹی کا سارا ماضی تھا۔ چھوٹی بڑی کئی ادبی چٹانیں، انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے تاریخ کے صفحات پر موجود تھیں۔ انہیں اپنی کم مایگی کا احساس تھا۔ مگر مرعوب نہ تھے۔ وہ سارے نام گنواتے ضرور ہیں مگر اس احساس کے ساتھ کہ کبھی میرا بھی نام ان لوگوں کے ساتھ لیا جائے گا۔ مرعوب ہوتا تو یہ شروع ہی سے جانتے نہ تھے بلکہ مرعوب کرنا ان کا فن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ غریب ماں باپ کے بچّے نے اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں بڑا زور مارا۔ ریاضت وہ بھی اس حد تک، کس کے بس کی بات ہے ـــ آج کل (اور اُس وقت بھی) لڑکے لندن اس لیے جاتے ہیں تاکہ ذرا عیش کر آئیں۔ پڑھنے کہاں جاتے ہیں۔ مگر پطرس نے وہاں جا کر نہ صرف پڑھا، بلکہ استادوں کو پڑھایا بھی۔ قدرت اگر پطرس کو لکھنے لکھانے کا موقع دیتی تو پھر ساری دنیا دیکھ لیتی کہ پطرس کا مقام، دنیا کے لکھنے والوں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

بخاری صاحب جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھتے تھے تو وہ کامل سکون اور سکوت چاہتے تھے۔ بالکل الگ تھلگ اور تنہا، جب کچھ لکھ لیتے تو پھر نچلے نہ بیٹھتے، فوراً اپنی موٹر نکالتے اور بھاگتے اپنے کسی ذہنی دوست کے پاس، تاکہ

اسے جا کر اپنا کارنامہ سنائیں۔ جب تک وہ اپنا لکھا ہوا مضمون، اپنے سارے دوستوں کو سنا نہیں لیتے تھے۔ انھیں چین نہیں آتا تھا۔ بے کل رہتے تھے۔

یہی حال، ان کا دوستوں کی تخلیقات کے بارے میں تھا۔ وہ ہر دوست سے پوچھا کرتے تھے۔ سناؤ بھئی کوئی چیز لکھی؟ کچھ لکھا ہو تو سناؤ، جب وہ بیچارہ سناتا تو یہ اس میں عجب ہی عیب نکالتے۔

امتیاز علی تاج نے مجھے بتایا۔ میں نے جب بھی پطرس کو کوئی چیز سنائی، اُس نے ہزار جگہ انگلی رکھ دی۔ چنانچہ میں مرحوم کی اس "حرکت" پر پریشان رہنے لگا اور یہ طے کر لیا کہ اب انھیں کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔ چنانچہ ایک دن میں اپنے کسی دوست کو اپنا کوئی مضمون سنا رہا تھا تو یہ دھم سے آ نکلے۔ میں نے انھیں دیکھا تو مضمون تہ کر کے رکھ دیا۔ پطرس نے تاڑ لیا۔ کہنے لگے۔ "اب مضمون کیوں نہیں سناتے؟"

تاج صاحب نے کہا۔ "آپ کو کوئی خاک سنائے۔ آپ تو ہر چیز میں سو سو کیڑے نکال لیتے ہیں۔ اس لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ آپ کو کوئی چیز نہیں سناؤں گا۔"

تاج صاحب کہتے ہیں۔ پطرس میرے اس جواب پر بڑے آزردہ ہوئے اور بڑے پیار سے کہا۔ "تاج! تو نے مجھے بڑا غلط سمجھا ہے۔ میں جب بھی تمھاری کوئی چیز سنتا ہوں تو میرے پیشِ نظر دنیا کے تمام بڑے بڑے ادیب ہوتے ہیں۔

میں تمہیں ان کے معیار پر پرکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہارا کام اور نام ان کے ساتھ لیا جائے اور تم ہو کہ مجھ سے ناراض ہو۔"

یہ تھی پطرس کی نقادانہ شان اور دوستوں کے فن کے بارے میں خلوص، اب کوئی مانے یا نہ مانے۔ آج پنجاب کے جتنے بڑے شاعر اور ادیب ہیں۔ تقریباً ان سب کے فن کے نکھار میں پطرس کا بڑا ہاتھ ہے۔ یقین نہ ہو تو میری بات کی تصدیق سالک، تاج، عابد، صوفی، راشد اور فیض سے کر لی جائے۔

ارے بھئی پطرس تو وہ بلا تھی جو علامہ اقبال تک سے بھڑ جایا کرتی تھی ایک دفعہ اقبال اور پطرس کی برگساں کے فلسفے پر بات چل نکلی۔ باتیں ہوئیں دلیلیں دیں اور لیں۔ کوئی بھی قائل نہ ہوا۔ بالآخر اقبال چپ ہو گئے۔ جب پطرس چلے گئے۔ تو اقبال نے ایک نظم پطرس کے بارے میں کہی جس کا عنوان "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" تھا۔ نظم یہ ہے۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا          زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی          ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی؟          کس طرح خودی ہو لازمانی
آدم کو ثبات کی طلب ہے          دستورِ حیات کی طلب ہے
دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق          مومن کی اذاں ندائے آفاق
میں اصل کا خاص سومناتی          آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیدِ ہاشمی کی اولاد          مری کفِ خاک برہمن زاد

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں — پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اقبال اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے بے خبر ہے

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سُن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دیں سرِ محمد و براہیم

"دل در سخن محمدی بند — اے پورِ علی ز بو علی چند

چوں دیدۂ راہ بیں نداری — قائد قرشی بہ از بخاری"

غور کیجئے اقبال پطرس کے بارے میں نظم کہتے ہیں۔ اقبال اُس وقت اپنے عروج کی آخری بلندیوں پہ تھے اور پطرس بلندیوں کی طرف ہمک رہے تھے مگر حوصلہ دیکھئے۔ پہاڑ سے ٹکر لے لی۔

اب ذرا مضمون میں توازن پیدا کر لوں۔ ورنہ آپ کہیں گے کہ میں برابر نیاز مندی برتتا چلا جا رہا ہوں۔ مرحوم تو واقعی بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے ان کی تعریف و توصیف نہ بھی کروں تو بھی ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ میرا "پٹڑا" ہو جائے گا۔ اسی الزام سے بچنے کے لیے مرحوم کے چٹکی لے رہا ہوں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو پطرس بے چارے اوتاروں کے زمرے سے نکل جائیں گے۔ دوسرے پطرس کے بدخواہوں میں سے کوئی مجھے جان سے نہیں

مارے گا ـــ وہ تو مرحوم ہیں۔ میں مرحوم بننا نہیں چاہتا۔ موت برحق ضرور ہے
مگر وہ پطرس کی وجہ سے کیوں آ جائے۔

پطرس کے ہاں فقروں، ترکیبوں اور خیالات کی تکرار بہت ہے۔ وہ
اپنے ایک دوست کو جن خوب صورت الفاظ سے یاد کریں گے۔ انہی الفاظ
اور انہی طرحدار ترکیبوں سے اپنے دوسرے دوست کو زیر کریں گے۔ مرحوم کو
کیا پتہ تھا کہ میرے بعد یہ کم بخت میری اس کمزوری کو اچھالے گا۔ یہ نقص مرحوم
کے خطوط میں زیادہ نمایاں ہے۔ اُن میں ایک ہی طرح کے الفاظ کھٹکتے ہیں۔
ترکیبیں کھلتی ہیں۔ بعض جگہ تو پیرے کے پیرے لڑھکے ہیں۔ مثالیں کیا دوں۔ خود
پڑھ لیجیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

اسی ضمن میں، میں نے ایک لطیفہ سنا ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے
راوی اس کا معتبر ضرور ہے۔ دلی میں جب عصمت چغتائی پطرس سے ملیں۔ تو یہ
ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ عہدے کا بھی رعب تھا اور پھر
یہ تھے بھی پطرس، مقابل میں بھی عصمت تھیں ایک ادیبوں کا امام، ایک "ادیبوں"
کی امامن۔

مرحوم نے تابڑ توڑ کئی خوب صورت فقرے کہہ ڈالے۔ عصمت چپ چاپ
خاموشی سے سنتی رہیں۔ جب پطرس ذرا تھمے تو عصمت نے کہا "آپ کے یہ
سارے فقرے میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ کوئی نیا فقرہ کہیے۔"

معلوم نہیں یہ دو بڑے ذہنوں کی زور آزمائی تھی، چھیڑ چھاڑ تھی یا افسانہ، عصمت بفضلِ تعالیٰ زندہ ہیں۔ اگر انھوں نے مجھے اس واقعہ کے غلط یا صحیح ہونے کے بارے میں لکھ دیا تو میں وہ آپ کو بھی بتا دوں گا ویسے آپ اسی شمارے میں عصمت کا بھی مضمون پڑھ لیں یہ واقعہ ممکن تو ہے پطرس بھی بلا، عصمت بھی بلا۔[1]

ویسے یہ واقعہ ہے کہ پطرس عصمت سے بہت متاثر ہوئے۔ مرحوم نے عصمت پر ایک بڑے زور کا مضمون لکھا تھا۔ پاکستان ٹائمز میں عصمت کے مضمون "دوہیرو ئن" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ دوستوں میں بیٹھ کر عصمت کے فن کی تعریف کی۔

پطرس کے مزاج میں ایچ پیچ ہی ایچ پیچ تھی۔ زندگی کے عام چلن میں، کبھی یکسانیت ہی یکسانیت سے اکتا بھی جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کالج کے زمانہ میں انھوں نے دیا سلائی کی ڈبیاں چرانے کی ایک سوسائٹی بنائی۔ دوستوں سے سگریٹ سلگانے کے لیے دیا سلائی مانگتے، سگریٹ سلگاتے، ماچس جیب میں ڈال لیتے۔ شام کو باقاعدہ حساب ہوتا۔ بخاری کی جیب میں باقی ممبروں سے زیادہ ڈبیاں برآمد ہوتیں۔ حتیٰ کہ یہ اپنے پروفیسروں تک کی ڈبیاں صاف کر دیا کرتے تھے۔ سالک صاحب راوی ہیں کہ ایک بار انھوں نے اپنے ایک پروفیسر سے ماچس مانگی۔ سگریٹ سلگانے کے بعد، جونہی انھوں نے ڈبیا جیب میں ڈالی۔ پروفیسر نے چلّا کر کہا۔ بخاری خدا کے لیے میری ماچس نہ چرانا۔ بخاری نے ماچس واپس کر دی۔ اور اس دن سے یہ

---

[1] دونوں کی پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ ملنے میں پہل پطرس کی طرف سے ہوئی۔ مگر، یہ واقعہ وہاں کا ہے۔

سوسائٹی بھی توڑ دی۔ آرٹ پر آنچ جو آگئی تھی۔

کالج کے زمانے کی بعض شرارتوں کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون "ہوسٹل میں پڑھنا" میں کیا ہے۔ یہاں ان کا اعادہ اُن طبیعتوں پر بار ہوگا۔ جن "مظلوموں" نے وہ کتاب پڑھی ہے اور بار بار پڑھی ہے۔

عابد صاحب نے بتایا۔ ایک رات میں، حسرت، تاثیر، صوفی اور پطرس موٹر پر گھوم رہے تھے۔ رات اپنے شباب پر آ رہی تھی کہ ہم میں سے کسی نے کہا۔ پیاس لگی ہے۔ لیمونیڈ پیا جائے۔ کچھ کچھ دکانیں کھلی تھیں۔ جن میں ایک سگریٹ والا بھی تھا۔ اس کے پاس لیمونیڈ تھی۔ بخاری صاحب نے ان پینے والوں سے پوچھا۔ "پیسے ہیں آپ کے پاس"۔ جیبیں ٹٹولی گئیں تو سب کی کل پونجی سوا چھ آنے نکلی۔

سب موٹر ہی میں بیٹھے رہے۔ پانچ لیمونیڈ کا آرڈر دیا گیا۔ جب سب پی کر ڈکار لے چکے تو بخاری صاحب دکان دار سے کہنے لگے۔ بڑے میاں! یہ لوگ شریفانہ لباس میں ضرور ہیں۔ مگر ہیں سب کے سب آوارہ اور اسی لئے ان کی جیبوں میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ ان لفنگوں کی دوستی میں، مجھ جیسے شریف آدمی کا بھی حال پتلا ہوگیا ہے۔ بہر حال ہم اس وقت آپ کے سوا روپے کے مقروض ہیں۔ اعتبار کر لیں تو یہ رقم کل تک پہنچا دوں گا۔ اگر آپ کو میری بات پر اعتبار نہ ہو تو یہ میری ۲۵ ہزار کی گاڑی کل تک کے لیے گروی رکھ لیں۔ ہم آپ کا سوا روپیہ دے جائیں گے تو یہ اپنی موٹر لے جائیں گے۔

ابھی دکان دار فیصلہ ہی کر رہا تھا کہ موٹر گروی رکھ لوں یا اعتبار کر لوں۔ بخاری صاحب نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ دکان دار ہکّا بکّا رہ گیا۔ ضرور سوچتا ہوگا پائجامہ بھی اچکا ہی نکلا۔[1]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب یہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ انھوں نے ایک گٹار خریدا اور اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر دلّی کی نواحی بستیوں میں گھر گھر جا کر یہ صدا دی۔

"بابا اللہ کے نام پر کچھ ملے گا؟"

ہم دونوں بھائی کل رات سے بھوکے ہیں"

"بھلا کر بھلا ہوگا"

اپنے بچوں کے صدقے میں ہمیں کھانا کھلا دو"

معلوم ہے ان کا ساتھی کون تھا؟ سابق گورنر جنرل پاکستان غلام محمد!

پطرس کے یہ مشغلے عجیب ضرور تھے۔ مگر ان میں زندگی سے پیار اور اس سے لطف اندوز ہونے ہی کے تو سارے رنگ روپ ہیں۔ مرحوم کو معلوم تھا۔ زندگی بڑی نعمت ہے۔ اسے ہر رنگ میں بسر کر دیکھو۔ میرا خیال ہے وہ دیلے اپنی کوئی حسرت ساتھ لے کر نہیں گئے۔ سوائے لکھنے لکھاتے کے۔

تاج صاحب نے مجھے بتایا۔ ایک بار حفیظ جالندھری، پطرس سے

---

[1] دیلے دوسرے دن یہ رقم مع سُود کے ادا کر دی گئی تھی۔

ناراض ہو گئے۔ دوستوں کی ناراضی پطرس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بے چین اور بیکل رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن کہنے لگے۔ حفیظ مجھ سے ناراض ہے۔ چلو اسے چل کر منائیں۔ چنانچہ میں اور پطرس، حفیظ صاحب کے ہاں پہنچے۔

پطرس نے جاتے ہی کہا۔ حفیظ میری خطائیں معاف کر دو۔ میں آج معافی ہی مانگنے آیا ہوں۔ پطرس نے ہر ہر انداز سے چاہا کہ حفیظ کی ناراضی ختم ہو۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مرحوم آزردہ ہو کر لوٹے۔

کوئی آٹھ دس دن ہوئے حفیظ صاحب میرے دفتر آ نکلے۔ میں نے اس واقعہ کے بارے میں استفسار کیا۔ فرمانے لگے۔ "تم نے جو کچھ سنا ہے۔ ٹھیک ہے۔"

"آخر بات کیا تھی؟"

"تمہیں کیا بتاؤں طفیل! بخاری میرا دوست تھا۔ جگری دوست! اس جیسا آدمی پاکستان نے پیدا ہی نہیں کیا۔ ذہانت اس پر ختم تھی۔ دوستانہ حقوق کی بجا آوری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھا، مگر ــــ"

"مگر کیا؟"

"وہ کم بخت پاکستان کی بعض ایسی شخصیتوں کی صلاحیتوں کا منکر تھا جو میرے نزدیک واجب الاحترام تھیں"

حفیظ صاحب کہنے کو تو یہ فقرہ کہہ گئے۔ میں نے بھی سن لیا۔ مگر

میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ کوئی بڑا آدمی، اگر دوسرے کی بھی بڑائی کا اقرار کر لے تو اس کی اپنی بڑائی پر حرف آجاتا ہے یا وہ سمجھ لیتا ہے کہ حرف آگیا۔۔۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس معاملے میں، پطرس کی نظر ہی چوک گئی ہو اور انھوں نے ان بزرگوں کو سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ مگر ان کی تحریروں، تقریروں اور خطوں سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے پاکستان کی بقا کے لیے مرحوم کے کارنامے امٹ ہیں۔ دنیا میں ان کی حُبّ الوطنی کا شہرہ رہا۔ یو۔ این۔ او کی در و دیوار مرحوم کی پاکستان دوستی کی قسمیں کھانے کو تیار ہیں۔ میرے دعوے کی تصدیق میں بڑا مواد موجود ہے۔

بخاری صاحب کو کوئی باتوں سے جیت لے۔ یہ ناممکن تھا۔ آغا اشرف بتاتے ہیں کہ لیک سکس میں بخاری صاحب کا جب پہلی پریس کانفرنس سے واسطہ پڑا تو یہ چہرے سے نڈھال نظر آئے۔ بخاری صاحب کو بھی معلوم تھا۔ میری زندگی اور موت کا فیصلہ آج ہی ہونے والا ہے۔ چنانچہ یہ اپنی جگہ پورے چوکس تھے۔

ہندوستانی اخبار نویسوں کو سوجھی، بخاری کا جلوس آج ہی نکال دیا جائے۔ چنانچہ وہ سب بڑھ بڑھ کے سوال کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کے پاؤں اکھڑ جاتے۔ مگر ادھر قدرت نے بخاری کو قوتِ گویائی

کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اکھڑتے تو کیسے اکھڑتے۔ یہ پے بہ پے اپنی لسانی اور مزاحی خوبیوں سے ہندوستانی اخبار نویسوں کو چپت کرتے رہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا ۔۔۔ پاکستان تو ہندوستان سے، تعاون کرنا ہی چاہتا ہے۔ مگر ہندوستان ہی راہِ راست پر نہیں ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ پاکستانی فوج کو مشترکہ ذخیروں میں سے کئی ہزار جوتے دیئے جائیں۔ جوتے دیئے تو گئے۔ لیکن جب صندوق کھولے گئے تو سارے جوتے بائیں پاؤں کے نکلے۔ دایاں پاؤں ایک نہ تھا۔

یہ اور اس قسم کے ہزاروں واقعات ہیں۔ جو بخاری صاحب کی غیر معمولی ذہانت و فطانت کے مظہر ہیں۔ کوئی اُن کا کہاں تک ذکر کرے۔ صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم راوی ہیں کہ فسادات کے دنوں میں امتیاز علی تاج بڑے ہی گھبرائے ہوئے تھے، ایک شام سالک، بخاری اور میں اس کے گھر گئے تو تاج کو بے حد خوفزدہ پایا۔ وہ بخاری سے کہنے لگے۔ اب کیا ہوگا بخاری صاحب نے کہا۔ کچھ بھی نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ یا تو پینک میں رہتے ہیں یا (Panic) پینک میں۔ سب ہنس پڑے۔ تاج صاحب میں بھی زندگی کے آثار نظر آئے۔

مجید ملک نے ایک دفعہ بخاری سے کہا کہ آپ اپنے مضامین کا

ایک مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام صحیح بخاری رکھیں۔ بخاری نے بے ساختہ جواب دیا۔ عزیزِ من! آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں اور اس کا نام کلامِ مجید رکھیں۔

ایک بار ایک صاحب نے بخاری صاحب سے پوچھا: بخاری صاحب آج کل آپ کچھ لکھ رہے ہیں؟"

بخاری صاحب نے جواب دیا۔"یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کسی عورت سے پوچھا جائے۔ تو حاملہ ہے؟"

اگر کوئی بخاری کے لطیفے، چٹکلے لکھنے ہی پہ آجائے تو پھر وہ لکھتا ہی چلا جائے گا۔ ایک دو نہیں، ہزاروں لطیفے (واقعی ہزاروں لطیفے) اگر میں نے اس سلسلے کو یہیں ختم نہ کیا تو بہت ممکن ہے یہ حصہ بخاری صاحب کی شخصیت پر چھا جائے اور خود بخاری صاحب چھپ جائیں۔ اس لیے یہیں چپ ہوتا ہوں۔

بخاری صاحب کو ڈرامے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے فن سے بھی کما حقہ، واقف تھے۔ جس کا ذکر اور کئی جگہوں پہ آئے گا۔ جب تک یہ گورنمنٹ کالج میں رہے۔ کالج کی ڈرامیٹک کلب زوروں پہ رہی۔ خوب خوب داد حاصل کی۔ ضرورت پڑتی تو خود بھی ڈرامے کا کردار بن جاتے اور لوگ بخاری کی ایکٹنگ، دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ ان کا ارادہ

تھا۔ پختہ ارادہ کہ ڈرامہ کے فن پر ایک مبسوط کتاب لکھیں۔ یہ اس ضمن میں اور دوستوں کو پکارتے رہے کہ میرا ساتھ دو تاکہ ایک کام ہو جائے مگر یہ خواہش ان کے ساتھ اس لیے دفن ہو گئی کہ ان کا کوئی دوست آگے نہیں بڑھا تھا۔

اور بھی کئی تخلیقی کام کرنا چاہتے تھے۔ جن میں ایک بچوں کے لیے درسی کتابیں لکھنے کا پروگرام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بچوں کیلئے ایسی درسی کتابیں لکھی جائیں کہ پھر مدتوں اُن کی یاد بھلائی نہ جاسکے۔ اسی ارادے سے انھوں نے ایک اسکیم بنائی۔ جو کسی وجہ سے بار آور نہ ہوئی۔

ایک کتاب ایڈٹ بھی کر رہے تھے۔ نام تھا اس کا (A study of Pakistan) کئی ابواب میں اسے تقسیم کیا۔ جو بھی جس موضوع پر کام کی چیز لکھ سکتا تھا۔ اسے اس کام کی تکمیل کے لیے پکارا۔ ادبی رجحانات پر خود لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا۔ غرض بہت کچھ کرنے کے ولولے تھے جو ساتھ لے گئے۔ اگر وہ آخری عمر میں پاکستان سے باہر نہ جاتے تو وہ کچھ نہ کچھ کر گزرتے۔ وہ اسی خوشی میں زندگی بسر کرتے رہے کہ کچھ کریں گے ــ اگر انھیں یہ یقین ہوتا کہ کچھ نہیں کر پائیں گے اور چل دیں گے۔ تو یقیناً ان کا اس سے بھی پہلے انتقال ہو جاتا۔

اصل میں بخاری صاحب ادب ہی کے لیے سب سے زیادہ

موزوں تھے۔ مگر زندگی کی اُڑان میں وہ اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں جتنے بھی صاحبِ اختیار تھے۔ ان میں بھی کوئی ایسا دیدہ ور نہ ہوا۔ جو بخاری کی شخصیت کو پہچان لیتا اور ان سے ادب کے سنوارنے ہی کا کام لے سکتا۔

بخاری صاحب اپنی آخری عمر میں پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لیے کوشاں رہے۔ مگر انھیں وہ بھی نہ ملی۔ یہ بخاری صاحب کے ساتھ ظلم نہیں تھا تو کیا تھا۔ یہ بات ان کے لیے تو باعثِ فخر نہ تھی کہ وہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے۔ بلکہ اس یونیورسٹی کی خوش قسمتی تھی جس کے وائس چانسلر بخاری صاحب ہوتے۔

ایک دو واقعات، جناب شورش کاشمیری نے بھی خوب سُنائے جیسے شورش صاحب ہیں۔ ویسے ہی یہ واقعات، یعنی ہمت و شجاعت کے قصے، مرحوم کی مردانگی کے ایسے واقعات پر اور کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔

ایک زمانہ میں، ایک اخبار نویس کا کام یہ تھا کہ وہ بخاری صاحب کے خلاف لکھا کرتا اور جی بھر کے لکھا کرتا تھا۔ بخاری پہلے تو دل کو بہلاتے رہے کہ کسی دن یہ اللہ کا بندہ خود ہی راہِ راست پر آجائے گا۔ جب مایوس ہو گئے تو ایک دن اس اخبار کے دفتر جا پہنچے۔

اخبار کے ایڈیٹر کرسیٔ ادارت پر براجمان تھے۔ انھوں نے اس کے

کان میں کہا "مجھے آپ سے علیٰحدگی میں ایک کام ہے"

وہ صاحب سمجھے کام بنا۔ آج ضرور اپنی کارگزاریوں کا معاوضہ ملے گا۔ خوش ہو کر اُٹھے۔ من میں ہزاروں کی سوچ لی۔

جب بخاری صاحب اور جناب ایڈیٹر صاحب ایک الگ کمرے میں پہنچے تو انھوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ منہ سے کچھ نہ بولے بڑے اطمینان سے اس کے منہ پر زور سے چانٹا رسید کیا۔ ایک ادھر، ایک اُدھر، اس کے بعد چٹخنی کھول لی اور یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اُتر گئے اب اطمینان سے بیٹھا لکھتا رہ۔

متحدہ ہندوستان میں، جب انگریز کا طوطی بولتا تھا۔ خلافِ حکومت سرگرمیوں کے سلسلے میں، حاکمانِ وقت کو ارونا آصف علی کی تلاش ہوئی۔ وہ روپوش ہو گئیں۔ یہ بھی انہی دنوں کا قصہ ہے۔ جب بخاری صاحب ریڈیو کے ناخدا تھے۔

ریڈیو پر روز اعلان ہوتا۔ ارونا آصف علی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ جو صاحب ان کا اتہ پتہ بتائیں گے۔ انہیں انعام دیا جائے گا۔ یہ اعلان ایک دن نہیں ہوا۔ کئی دن ہوتا رہا۔

جو محکمہ لوگوں سے یہ کہتا تھا کہ ارونا آصف علی کا اتہ پتہ بتانے والے کو انعام دیا جائے گا۔ اسی محکمہ کے ناخدا کے گھر ارونا آصف علی رہتی تھیں۔

آصف علی سے مرحوم کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ واقعہ ایک طرف توحقِ دوستی کی آخری حد ہے اور دوسری طرف جرأت وہمت کی عجیب داستان!

بخاری صاحب نے زندگی بھر اپنے دوستوں سے ٹوٹ کر ہی محبت کی اور نبھائی۔ برخلاف اس کے ان کے دوست اتنے عاشق ثابت نہ ہوئے۔ اپنے خطوں میں انھوں نے کیا کیا گلے نہیں کیے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مرحوم کو چھوٹے موٹے کئی عارضے تھے۔ اُس پر کینسر جیسی خوفناک بیماری، موت ان کے سامنے مدّتوں ناچتی رہی۔ مگر یہ آنکھیں چرائے، دل کو طرح طرح سے بہلاتے رہے۔ بالآخر اس جیالے، مخلص اور عالم کو موت نے آن ہی دبوچا۔ آج یہاں سوگ ہے۔ عرش پر جشن ہوگا۔

یہ مانگے تانگے کا مضمون ہے۔ اس لیے میں نہیں کہتا—

"مستند ہے میرا فرمایا ہوا"

# اختر شیرانی

میں اپنے کسی کام سے دِلّی گیا ہوا تھا۔ وہ دن تھے ۱۹۴۷ء کے، مگر ابھی پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا ۔ لڑائی جھگڑے شروع تھے۔ اکیلا دوکیلا مسلمان اگر کسی ہندو کے ہتھے چڑھ جاتا، تو وہ اسے ختم کر ڈالتے تھے ۔۔۔ کوئی ہندو اور سکھ کسی مسلمان کے ہاتھ آجاتا تھا تو وہ اسے ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ غرض اپنے اپنے "مشن" کے مطابق، سبھی چوکس تھے۔ مگر بیچاری انسانیت منہ کے بل پڑی کراہ رہی تھی۔

انہی حالات میں، میں لاہور سے دلّی گیا تھا۔ مسلمانوں کی آبادی میں، ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ وہیں ٹھہرنا مناسب جانا۔ بازار جاتا تو اپنے دائیں بائیں دیکھتا کہ کہیں کوئی اپنا "فرض" پورا کرنے تو نہیں آرہا ہے۔

اتفاق کی بات کہ دلّی میں، میرے ایک بڑے ہی قریبی دوست

مل گئے۔ وہ لاہور سے ٹونک جانے کے لیے آئے تھے۔ تاکہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے حافظ محمود شیرانی کے کتب خانہ کو (مرحوم کی وصیت کے مطابق) لاہور لے جا سکیں ـــ انھوں نے مجھے کہا۔ "یہاں کا کام ختم کرو اور میرے ساتھ ٹونک چلو۔ اختر شیرانی سے ملاقات کرا دوں گا۔"

"آپ خدا سے بھی ملاقات کا وعدہ کریں، تو بھی ان حالات میں، آپ کے ساتھ نہ جا سکوں گا۔"

"دیکھو حالات بڑے بُرے ہیں۔ اس لیے اکیلے سفر نہ کریں۔ میرے ساتھ ٹونک چلیں۔ پھر اکٹھے لاہور جائیں گے۔"

بہر حال میں اپنے دوست کی باتوں میں آ گیا۔ بجائے لاہور واپس ہونے کے، لاہور سے اور دور ہونے کے لیے، ٹونک کا ٹکٹ کٹوا لیا۔ ٹونک پہنچے۔ اختر شیرانی ملے۔

اتفاق کی بات کہ اُس وقت اختر بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ بڑے پیار اور بڑی محبت سے پیش آئے۔ ہم نہال ہو گئے۔ سفر کی کوفت دور ہو گئی۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا۔ کل آپ لوگوں کو کتابیں دے دی جائیں گی۔ ہم خوش!

اختر شیرانی کے داماد نے آ کر خبر سنائی۔ ریڈیو نے بتایا ہے کہ لاہور جل رہا ہے۔ ہر طرف آگ بی آگ ہے۔ ہم دونوں پریشان ہو گئے۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ مجھے اپنی والدہ اور چھوٹے بھائیوں کا بار بار خیال آتا اور نیند

اُچٹ جاتی۔

صبح ہی صبح اختر صاحب کے ایک دوست آ نکلے۔ جسے شکل وصورت اور لباس کے اعتبار سے اختر صاحب کا دوست نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ انھیں ساتھ لے گئے ہم چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر اختر صاحب کا انتظار کرتے رہے۔ مگر نہ لوٹے۔ کوئی تین چار بجے لوٹے۔ مگر دُھت!

ہم سے مخاطب ہوئے۔ "آپ لوگ کون ہیں اور کیا لینے آئے ہیں؟"

میرے دوست نے کہا۔ "آپ نے ہمیں بُلایا ہے اور ہم لاہور سے کتابیں لینے آئے ہیں۔"

"مَیں نے نہیں بُلایا۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

ہوائیاں تو ہماری پہلے ہی اُڑی ہوئی تھیں۔ اب طوطے بھی اُڑ گئے اختر صاحب برابر کہتے رہے۔ آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ ابھی چلے جائیں۔ مگر ہم صاحب غرض تھے۔ چُپ رہے۔

گھر والوں نے اختر صاحب کا اصرار دیکھا، تو ہمیں منتوں سے کہا۔ درگزر سے کام لیجیے۔ کل آپ کو کتابیں دلوا دی جائیں گی۔

پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے کہ اختر صاحب سے پھر ملاقات ہو گئی۔ مگر اب وہ پہلے والے اختر نہ تھے۔ نشہ تو تھا۔ مگر اتنا نہ تھا کہ اپنا ہوش نہ ہو۔ کہنے لگے آئیے میں آپ کو اپنے کھیتوں پہ لے چلوں۔ ہمارے

ہاں کے خربوزے بڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ پاس ہی ندی بھی ہے۔ نہا بھی لیں گے۔

ہم دونوں بھرے بیٹھے تھے۔ کہہ دیا۔ "ہم نہیں جائیں گے۔"

آزردہ ہو گئے۔ گلوگیر آواز میں کہا۔ "آپ کو میری قسم چلنا ہوگا۔"

"ہم نہیں جائیں گے۔"

"اگر میں آپ حضرات سے معافی مانگ لوں۔ پھر بھی نہ جائیں گے؟"

اس پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ غصہ دُور ہو گیا۔ ساتھ ہو لیے۔ احتیاطاً اختر صاحب کے داماد کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس پر کہنے لگے "آپ لوگوں نے بچہ پارٹی کو بھی اپنے ساتھ نتھی کر لیا ہے۔ اس لیے لطف نہ آئے گا۔"

"ہم نے انہیں اس لیے ساتھ لے لیا ہے کہ کہیں آپ ندی میں دھکا نہ دے دیں۔"[1]

میرے اس فقرے پر اختر صاحب میرے گلے لگ کر رونے لگ گئے۔ میں نے سوچا۔ یا اللہ یہ کیا مصیبت ہوئی — عرض کیا جناب آپ بیشک ہمیں ندی میں دھکا دے دیں۔ مگر اب چپ ہو جائیں۔

ٹونک کے خربوزے واقعی بڑے میٹھے تھے۔ ریتلی زمین تھی اور یہ بڑے بڑے خربوزے۔ اختر صاحب اپنے ہاتھ سے توڑ توڑ کر کھلاتے رہے جیسے چاہتے ہوں کہ ہم دن کی بات بھول ہی جائیں — شام ہو گئی۔ ہم نے کہا۔ "گھر چلیے۔"

---

[1] جب اختر صاحب لاہور آئے تو انھوں نے بتایا کہ میرا وہ بچہ جسے تم اپنے ساتھ اس لیے لے جا رہے تھے کہ کہیں تمھیں ندی میں دھکا نہ دے دوں — وہ خود اسی ندی میں ڈوب گیا۔

کہنے لگے: "واہ ابھی تو نہائے ہی نہیں۔"

"حضور کل نہالیں گے۔ آج تو شام ہو گئی۔"

"شام ہو گئی ہے تو کیا ہوا۔ نہانا موقوف نہیں ہو سکتا۔"

ہم نے سوچا کہ لیجئے پھر آ گئے اپنی آنی پر، مگر جلد مان گئے۔ اتنا کہا کہ نہائے بغیر واپس نہ جانے دوں گا۔ بڑا ٹھنڈا پانی ہے اس کا، لاہور جا کر یاد کیجئے گا۔"

ہم نے کہا: "جناب، ہم خوب یاد رکھیں گے۔ مزید نوازش کی کیا ضرورت!"

معصوم سے انسان نے، ہماری بات کو سنا تھا۔ سوچا تو تھا۔

"یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔"

تیسرے دن صبح، اختر صاحب نے ہمارے ساتھ چائے پی۔ کل کی باتوں پر افسوس کرتے رہے۔ کتابیں نکال کے دیں اور کہا۔ ان کی فہرست بنا لیجئے اور رسید مجھے دے دیجئے ۔۔۔ ہم نے بڑا زور مارا، رسید لاہور سے بھجوا دیں گے مگر وہ نہ مانے ۔۔۔ ہنس کر کہنے لگے۔ اگر آپ لوگوں نے اچھی اچھی کتابیں راستے میں اڑا لیں۔ تو میں کیا کر لوں گا ۔۔۔ غرض ہم کتابوں کی فہرست بنانے میں لگ گئے اور یہ باہر نکل گئے۔

اختر صاحب کے داماد کو غالباً میاں کہتے تھے۔ شاید نام میاں محمد ہو۔ وہ

بھی ہمارا ہاتھ بٹاتے رہے۔ مگر اختر صاحب سے ہماری ملاقات نہ ہوئی۔

چوتھے دن اختر صاحب ملے اور یہ کہہ کر باہر نکل گئے۔" ابھی آیا۔"

ہم نے بہ منت کہا۔" ذرا دو منٹ رک جائیے۔ کتابوں کی رسید لے لیجئے اور ہمیں چھٹی دے دیجئے۔ مگر وہ نہ مانے ۔۔" ابھی آیا "۔۔ کہہ کر نکل گئے۔

شام کے قریب آ نکلے۔ بالکل دُھت۔ سیدھا ہماری طرف آئے۔ "ان بکسوں میں کیا ہے؟

"کتابیں ہیں؟"

"کونسی کتابیں؟"

"جو لاہور جائیں گی۔"

"کس کی اجازت سے جائیں گی۔ کھول دو بکسوں کو۔ ابھی کھول دو۔"

میرے دوست پٹھان تھے۔ چہرے پہ نورانی داڑھی اور خود بڑے پرہیزگار قسم کے آدمی، انھیں غصہ ہی تو آگیا۔ کڑک کے بولے۔" کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں کہہ رہا ہوں۔ کتابوں کے بکس کھول دو۔ یہ تیرے باپ کی کتابیں ہیں جو لے جا رہا ہے۔"

میرے دوست پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ ادھر اختر صاحب نے باپ تک نوبت پہنچا دی تھی۔ وہ تلملا کے اٹھے اور ایک تھپڑ اختر صاحب کے

رسید کرنا چاہا۔ مگر میں ایک دم بیچ میں کھڑا ہو گیا اور وہ پتھر میرے لگا۔

اختر صاحب کے گھر والے بھی یہ سارا تماشہ دیکھ اور سُن رہے تھے۔ غالباً اختر صاحب کی والدہ نے دروازے کی اوٹ سے کہا۔ "آپ حضرات مجھے معاف کر دیں۔ میرا اس کا اتنا ہی رشتہ ہے۔ مگر میں اس کی موت کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں — مگر اسے موت بھی نہیں آتی —— یہ آواز کانوں میں پڑی تو ایک دم سناٹا چھا گیا۔ میاں، اختر صاحب کو گھر کے اندر لے گیا۔

فسادات کی خبریں، ہم ریڈیو پر روز سنتے تھے کہ لاہور میں یہ ہو گیا لاہور میں وہ ہو گیا۔ مگر اختر صاحب ہمیں چھٹی ہی نہ دیتے تھے۔ خواہ مخواہ ہی وقت ضائع کر رہے تھے۔ ہم دونوں حد درجہ پریشان تھے۔ ایک اختر صاحب کے سلوک سے، دوسرے ملک کے بگڑے ہوئے چلن سے، مگر کیا کرتے۔ اختر صاحب نے جو باندھ رکھا تھا۔ ہم دونوں روز یہ فیصلہ کرتے 'کل جو کچھ بھی ہو ہم ضرور چلے جائیں گے۔

پانچویں دن، جب صبح صبح اختر صاحب کی زیارت ہوئی تو میں نے جل تُو جلال تُو، آئی بلا ٹال تُو، کا نعرہ بلند کیا۔ اختر صاحب نے سُن لیا۔ سیدھا میری طرف آئے۔ میرے کان اینٹھ کے، بڑے ہی پیار میں کہا۔ "جانِ من ابھی تک ناراض ہو؟"

نہیں تو!"

"مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں ناراض ہو۔ میں دونوں سے معافی مانگتا ہوں"۔

"معاف ہم اس صورت میں کریں گے۔ جب آپ ہمیں آج رخصت کردیں"۔

"آج نہیں کل چلے جانا۔ آج اس لیے نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کو راضی کرلوں۔ ورنہ آپ لوگ لاہور جاکر ضرور کہیں گے کہ اختر بڑا تھرڈ کلاس انسان تھا"۔

اس پر ہم دونوں ہنس پڑے اور خوب ہنسے"۔

پھر گویا ہوئے ـــ "میں بڑا اچھا آدمی ہوں۔ بعض اوقات میرا امپریشن بڑا غلط پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ مجھے گھٹیا آدمی سمجھ لیتے ہیں۔ اب بتائیے اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ قصور تو سمجھنے والے کا ہے"

"جی ہاں قصور تو سمجھنے والوں کا ہے"۔

"اگر میرے ملنے والے سمجھ دار ہوں اور وہ میرے دل کے اندر جھانک کے دیکھ لیا کریں تو پھر کسی کو بھی مجھ سے شکایت نہ ہوگی"۔

"آپ بے سمجھ لوگوں سے ملتے ہی کیوں ہیں ؟"

"میں بے سمجھ لوگوں سے کہاں ملتا ہوں۔ وہی لاہور سے آجاتے ہیں"۔

"میرے ساتھی جو غصے سے اب بھی بھرے بیٹھے تھے اور بالکل چپ تھے ـــ ان کے گلے میں اختر صاحب نے باہیں ڈال دیں اور منانے کے انداز میں کہا۔ "مولانا میں آپ کا بوسہ لے سکتا ہوں"۔

اس پر مولانا بھی ہنس دیئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ سارا دن ہنسی خوشی گزرا اور اختر صاحب نے بھی ہماری دلداری کے سارے سامان کر ڈالے۔ کبھی کچھ کھلاتے کبھی کچھ، کبھی اپنی کوئی غزل سنادی اور کبھی میر و حافظ کی، غرض وہ دن اتنا پُرلطف گذرا کہ ہم ساری کلفت بھول گئے۔ وقتی طور پر ہمیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ لاہور جل رہا ہے اور ہمارے ماں باپ اور بہن بھائی وہاں ہیں۔

اختر صاحب کا موڈ کچھ زیادہ ہی یارانہ ہوگیا تھا۔ ممکن ہے اس لیے کہ ان کی خاطر میں نے تیتر کھایا تھا۔ جھٹ پٹا ہوا تو مجھ سے کہنے لگے۔ "آؤ طفیل تمھیں سیر کرا لاؤں۔"

میں نے اپنے دوست کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اختر صاحب نے ہاتھ جوڑ کر مزاحاً کہا۔ "نہ بابا انھیں یہیں رہنے دو۔ یہ تو فوراً آستین چڑھا لیتے ہیں۔ میں بھی پٹھان ہوں اگر مجھے بھی غصہ آگیا تو ایک آدھ لاش تمھیں اٹھانی پڑے گی۔"

غرض میں اور اختر صاحب سیر کو نکلے۔ گلی سے گزر کر بازار تک آئے تو اختر صاحب نے کان میں کہا۔ "جیب میں کچھ روپے ہیں؟"

"جی ہاں تھوڑے سے۔"

"کتنے؟"

"تیس کے قریب۔"

"ٹھیک ہے،

اب اختر صاحب بجائے اس کے کہ ٹونک کے بازاروں کی سیر کراتے یہ مجھے ٹونک کی گلیوں میں لئے پھرے۔ ایک گلی سے نکلتے، دوسری میں جا داخل ہوتے۔ کوئی دس پندرہ منٹ کی کوچہ گردی کے بعد ایک دکان کے سامنے جا رُکے۔

"ایک پوّا دے دیجئے"

دکاندار — "پہلے سابقہ حساب چکائیے۔"

"وہ ہو جائے گا۔"

"پہلے وہ ادا کیجئے۔"

"یہ شریف آدمی لاہور سے آئے ہیں۔ ان کے سامنے جھگڑا نہ کرو میرا تو روز کا آنا جانا ہے۔"

"شراب اور شرافت! — ہنہ! — روپے ہوں تو دیجئے۔ ورنہ جائیے۔ راستہ پکڑئیے۔ میں پہلا حساب چکائے بغیر شراب نہ دوں گا۔"

یہ ساری باتیں اتنی تیزی سے ہوئیں کہ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اختر صاحب مجھے ایک شراب کی دکان کے سامنے جا کر کھڑا کر دیں گے۔ اور باتیں یہ یہ ہوں گی — مجھے ہوش آیا تو میں نے اختر صاحب سے کہا۔ "چلئے اب گھر چلیں۔ چھوڑئیے شراب کو۔"

"کیسے چھوڑ دوں اس کا باپ بھی دے گا۔"

پھر باپ تک گیا تو اُلٹے ہاتھ کا ھتّڑ دوں گا۔

میں نے دل میں سوچا کہ اتنا بڑا شاعر اور یہ گت، میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میرا رُواں رُواں کانپنے لگ گیا۔ میرے دل میں اختر صاحب کا بے حد احترام تھا۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ دکاندار سے لڑ جھگڑ کر شراب دلوائی۔ کچھ پہلے روپے دیئے۔ کچھ اس نے پوتے لیے۔

اختر صاحب کے ہاتھ میں شراب کی بوتل آئی۔ تو دکان سے دو ہی قدم کے فاصلے پر کاک کھول کر پینے لگے۔ بجا بجتی میں پہلے ہی رات ہو چکی تھی۔ اندھیری گلیاں تھیں۔ مجھے راستہ کا کچھ پتہ نہ تھا۔ میں نے سوچا اختر صاحب نے پی لی تو میں گھر نہ پہنچ سکوں گا۔ اس لیے میں نے اختر صاحب سے کہا۔ بوتل مجھے دے دیجئے۔ گھر جاکر پیجئے گا۔ مگر وہ نہ مانے۔ بوتل تو نہ دی۔ مگر گھر جاکر پینے کا اقرار کرلیا۔

ابھی تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ پھر مجھے ان کے کچھ پینے کی آواز آئی۔ میں گھبرا گیا کہ یہ ابھی پی کر کہیں گر جائیں گے اور مجھے گلیوں ہی میں رات بسر کرنی پڑے گی ایک ترکیب مجھے سوجھی ــــ "اختر صاحب میں آپ کو ایک اور بوتل لے دیتا ہوں۔ مگر اس شرط پر کہ گھر جاکر پئیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

ایک اور بوتل خریدی گئی۔ کچھ دیر تو صبر کیا۔ جہاں ذرا زیادہ اندھیرا ہوتا۔ یہ ایک دو گھونٹ پی جاتے۔ میں کہتا۔ "اختر صاحب یہ کیا کر رہے ہیں" ــــ کہتے ـــ "کچھ نہیں تمھارے تو کان بج رہے ہیں۔"

میری ٹوکا ٹاکی میں اتنا ہوا کہ وہ غٹاغٹ پینے کی بجائے داؤ لگنے پر
ہی ایک ایک دو دو گھونٹ کر کے پیتے رہے۔ چلتے رہے۔ اب وہ پیچ در
پیچ گلیوں سے نکل آئے تھے اور اُس جگہ آ گئے تھے۔ جو میرا دیکھا بھالا راستہ
تھا۔ اب میری بھی جان میں جان آئی ـــــ دیکھا تو خالی بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔
اب اُن کے قدم بُری طرح لڑکھڑانے لگے تھے۔ میں نے سہارا دیا۔
تھوڑی دُور چلے تو ٹھوکر کھا کر گرے۔ میں نے اُٹھایا۔ کپڑوں سے گرد جھاڑی۔
مگر یہ پھر میرے قابو میں نہ رہے۔ ان میں ذرا بھی تو جان نہ تھی۔ میں انھیں بہتیرا
سہارا دیتا۔ بہتیرا سنبھالتا۔ مگر یہ سب کچھ میرے بس میں نہ رہا۔ جیسے تیسے یہ
گھر والی گلی میں پہنچے اور ڈھیر ہو گئے۔ میں نے ہزار اٹھانا چاہا۔ مگر اٹھ نہ سکے
ناچار گھر والوں کو خبر کر دی۔ ایک صاحب اختر صاحب کو کندھوں پہ اٹھا کے
لائے۔

ہم اپنے سفر ٹونک کے چھٹے روز اس قابل ہو سکے کہ اختر صاحب سے
رخصت ہو سکیں۔ مگر عین وقت پر اختر صاحب نے بتایا کہ میں کل چنگی والوں سے کہہ
آیا تھا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں۔ کتابیں ٹونک سے باہر نہ جائیں۔ اختر صاحب
نے یوں اس لیے کیا تھا تاکہ وہ ہمارے سلسلے میں 'اپنے سابقہ گناہوں" کی تلافی
کر سکیں اور یہ بھی کہ کہیں ہم بغیر ان کی اطلاع ہی کے چلتے نہ بنیں۔ یہ راز آخری دن
صبح کی چائے پر کھلا۔

"آج ہم جا رہے ہیں۔"

"آپ لوگ جا ہی نہیں سکتے۔"

"آج تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی"

"جا کر دکھائیے۔ میں کل چنگی والوں سے کہہ آیا تھا کہ جب تک میں ساتھ نہ آؤں۔ کتابیں ٹونک سے باہر نہ جائیں۔ اور پھر کتابیں ٹونک سے باہر لے جانے کا اجازت نامہ تو میری جیب میں ہے۔

اب ہم او ریگر ائے کہ یہ اچھا خلوص ہے۔ پہلے ہم ان کے شوق سے عاجز تھے۔ اب ان کے خلوص سے اگر کیا کرتے۔ پھنسے ہوئے تھے۔ پریشان تھے۔

اختر صاحب ہمیں خوش کرنے پر تُلے ہوئے ہی تھے۔ دیکھو؛ سامنے جو مٹی کا بڑا سا مٹکا ہے۔ اس میں میری جان ہے۔ اس فقرے پر مجھے پرانے زمانے کے جادوگروں، دیوؤں اور پریوں کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔

"اچھا کیا ہے اس میں؟"

"میری معشوقاؤں کے خطوط ــــ اختر صاحب ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں لپکا مٹکے کی طرف، جتنی تیزی سے میں اُٹھا اس سے بھی سرعت کے ساتھ اختر صاحب جھپٹے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے ــــ بھئی یہ زیادتی ہے۔ انھیں میرے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا۔"

"میں پڑھنا نہیں چاہتا۔ بس دیکھنا ہی چاہتا ہوں۔"

"اچھا ۔۔۔ یہ کہہ کر اختر صاحب نے ٹنکے میں ہاتھ ڈالا۔ درجنوں خط دبوچ لائے ۔۔۔ دیکھو یہ خط فلاں کا ہے ۔ یہ خط فلاں کا ہے ۔۔۔ اور یہ خط فلاں کا ۔۔۔ مگر ان میں سے ایک خط بھی نہ دوں گا۔"

"مانگ کون رہا ہے؟"

"اچھا تمھیں ان خطوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پڑھ کر دیکھو تو پھڑک اٹھو گے۔ جوانیاں انگڑائیاں لے رہی ہیں ان میں۔ بہرحال میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ پایا۔ وہ یہی کچھ ہے ۔ میری جان بھی یہ، میرا ایمان بھی یہ"

"ان میں سے چند ایک خط تو مجھے دے ہی دیجیے۔ تاکہ میں اُن لوگوں کو دکھا سکوں ۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اختر پر کوئی بھی لڑکی نہیں مرتی تھی! ہماری نظمیں فرضی ہیں؟"

"کون! تو یہ کہتا ہے ۔ اچھا تو تم یہ خط لے جاؤ ۔ جو یہ کہتا ہے انھیں دکھا دینا۔ بدمعاش کہیں کے!"

میں وہ خط لے آیا تھا ۔ جو اختر صاحب کے ہاتھ پہلے ہی ہلے میں لگے تھے اور وہ خط آج بھی میرے پاس کہیں پڑے ہیں ۔ اس وقت انھیں ڈھونڈھنا اس لیے بھی فضول ہے کہ شاید اُن کی اشاعت مناسب نہ ہو ۔ کیونکہ ؏

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے، ابھی حال ہی میں، اختر شیرانی پر ایک مضمون لکھا ہے ۔ جس میں انھوں نے کہا ہے کہ اختر پر کوئی لڑکی وڑکی عاشق نہ تھی ۔ یہ سب

افسانے ہیں۔ ادھر حکیم نیر واسطی جو اختر صاحب کے قریبی دوستوں میں ہیں۔ یہ فرماتے ہیں کہ اختر پر ایک چھوڑ، درجنوں لڑکیاں مرتی تھیں۔

ایک لطیفہ سنتے چلیں ــــ مشہور واقعہ ہے کہ دلی میں سنڑ ماسٹرز دانس کے دفتر میں کسی نے مشہور مغنیہ منی بائی سے ان کا تعارف کرایا۔ اختر صاحب مارے شرم اور جھجک کے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ منی بائی نے شرارتاً کہا تھا۔ شاعر شباب تو کانپ رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی عاشق نہ تھی تو کیا نقصان ہوا۔ اگر درجنوں لڑکیاں مرتی تھیں تو فائدہ؟ لہٰذا اس بحث میں کیوں اپنا وقت ضائع کیا جائے

ویسے میں اسے اختر صاحب کی سادگی اور بھولپن ہی کہوں گا کہ انھیں اگر کوئی لڑکی خط لکھ دیتی تھی کہ ــــ مجھے آپ کی فلاں نظم پسند آئی ہے یا مجھے آپ کی شاعری بڑی عزیز ہے۔ تو یہ فوراً اس لڑکی کا نام محبوباؤں والے رجسٹر پر چڑھا دیتے تھے ــــ پھر دوستوں میں تذکرے ہوتے تھے ــــ خط و کتابت ہوتی تھی ــــ اور جواب محفوظ رکھے جاتے تھے ــــ جبھی تو خطوں سے ایک مٹکا بھر گیا تھا۔ وہی مٹکا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ــــ پتہ نہیں، اختر صاحب کیسے خط لکھتے ہوں گے۔ مگر جواب میں، جو خط میں نے دیکھے تھے وہ تو ایسے ہی تھے ــــ اختر تمہارے بغیر زندگی کا کوئی لطف نہیں ــــ قصہ کوتاہ، دلوں

کا حال اللہ ہی جانے یا دل والے جانیں۔ میں کیوں اِس پھڈے میں ٹانگ اڑا بیٹھا۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد، یہ خبر اُڑی کہ اختر شیرانی ٹونک سے لاہور آرہے تھے اور فسادیوں نے مسلمانوں سے بھری ہوئی اُس گاڑی ہی کو کاٹ ڈالا۔ جس میں اختر شیرانی اور ان کا پُورا خاندان سفر کر رہا تھا۔ اخباروں نے سرخی جمائی۔ "اختر شیرانی اور ان کا پورا خاندان شہید کر دیا گیا"

یہ خبر پڑھی تو مجھے بے حد صدمہ ہُوا جیسے کوئی میرا اپنا ہی شہید ہو گیا ہو۔ میرے ذہن میں ٹونک اور اس کی تمام تر یادیں گھومنے لگیں۔ اختر کی زبردستیاں بھی بھانے لگیں۔ اختر کی لڑکھڑاہٹوں پر بھی پیار آنے لگا۔ اختر کی سادگی اور ان کے خلوص بھرے دل کا خیال آنے لگا۔ یہ چوٹ کچھ اس طرح اچانک لگی تھی کہ اس کی ٹیسیں دل کے پار ہی اُترتی چلی جا رہی تھیں۔ میں اس حادثے کو بھول جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ بھولتا ہی نہ تھا۔ اختر کی کوئی نہ کوئی ادا، کوئی نہ کوئی بات یاد آجاتی۔ پریشان کر جاتی۔

اخباروں نے بڑے اچھے لفظوں میں اختؔر کی خدمات کو سراہا۔ ان کی شخصیت پر مضمون نکلے۔ احباب بھی رو لیے۔ ادب کے پرستار بھی رو دیے۔ اُن دنوں ہر اخبار اُن کی اس نظم سے مزیّن نظر آیا۔

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
آوارۂ غربت کو بھی سنا — کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن؟
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن ریحانِ وطن؟

او دیس سے آنے والے بتا!

اُس پس منظر کے ساتھ، جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ یہ نظم اور بھی رُلاتی تھی۔

اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ چند دنوں کے بعد، اس بھیانک خبر کی تردید چھپ گئی۔ سب خوش ہو گئے۔ اختر زندہ تھے۔

غالباً ۱۹۴۶ء میں اختر صاحب اچانک لاہور آ گئے۔ میں نے انھیں دیکھا تو سینے سے لگانے کو دل چاہا۔ عجیب تضاد ہے، انسان کی زندگی میں بھی، کہاں وہ دن تھے کہ ہم اختر صاحب سے بیزار تھے۔ کہاں یہ دن کہ انھیں دیکھ کر خوشی کے آنسو نکل آئے۔

اس مجموعے میں جو تصویر اختر صاحب کی ہے۔ وہ مجھے اختر صاحب ہی نے دی تھی۔ ایک دن تشریف لائے۔ کہنے لگے۔ اگر تم چاہو تو آج مجھے پانچ روپے میں خرید سکتے ہو۔ میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے"؟ —— جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی تصویر نکالی اور میری طرف بڑھا دی —— یہ اختر شیرانی ہے۔ اس کی قیمت

پانچ روپے ہے۔

ایک روز یہ ہمارے دفتر کے سامنے تانگے پر بیٹھے۔ انھوں نے تانگے والے سے کہا۔ انارکلی میں سے فلاں جگہ چلو۔ کوچوان نے کہا۔"اُدن وسے ٹریفک ہے۔ میں اس طرف سے نہ جاسکوں گا۔

"نہیں نہیں ادھر ہی سے چلنا ہوگا"

"میرا چالان ہو جائے گا"

"میں ذمہ دار ہوں میں نواب ممدوٹ سے کہہ دوں گا (اُن دنوں نواب صاحب پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے) میں ڈپٹی کمشنر سے کہہ دوں گا۔ مگر تم چلو ادھر ہی سے"

تُو تُو میں میں ہونے لگی تو میں اُٹھا اور اختر صاحب سے کہا۔ "آخر ضرورت ہی کیا ہے کہ آپ ایک معمولی سی بات کے لیے نواب ممدوٹ کے پاس جائیں یا ڈپٹی کمشنر سے کہیں۔ تانگے والا جدھر سے جاتا ہے اسے جانے دیجیے"

"میں تو اسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں ۔ اختر شیرانی ہوں"

اختر صاحب کے پاس ہزاروں روپے آئے اور انھوں نے ہزاروں ہی اڑا دیئے۔ مثال کے طور پر اگر آج کہیں سے دو چار سو روپیہ مل گیا ہے۔ تو شام تک ختم، وہ کہا کرتے تھے کہ روپیہ کا مقصد یہ ہے کہ دوستوں پر خرچ کیا

جائے یا پھر شراب پی جائے۔ انھیں شرابی کی حیثیت سے سب جانتے ہیں۔
دوست کی حیثیت سے کم لوگ جانتے ہوں گے۔

نازش صاحب کہتے ہیں کہ ایک دن اختر صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے فلاں دوست کی نوکری چھوٹ گئی ہے اور وہ دو تین مہینوں سے بیکار ہے نوبت فاقوں تک آن پہنچی ہے تو یہ بڑے پریشان ہوئے۔ دو تین دن تک دوڑتے بھاگتے رہے۔ کہیں سے تین سو روپوں کا انتظام کر لیا۔ مجھے ڈھونڈھا ساتھ لے کر، دوست کے مکان کی طرف چلے۔ مکان آیا تو خود نیچے ٹھہر گئے مجھے کہا کہ "اوپر جا کر روپے دے آؤ"۔ میں نے کہا: "اختر صاحب اپنے ہاتھ سے دیجئے"۔۔۔۔ کہنے لگے۔۔۔۔ "خود روپے دیتے ہوئے شرم آئے گی"۔

آخری دنوں تو ان سے روزانہ ہی ملاقاتیں رہیں۔ کہیں نہ کہیں سے جھومتے ہوئے آنکلتے۔۔۔۔ اختر صاحب مجھے اصلی نام سے نہیں پکارا کرتے تھے۔ بلکہ فروغ اردو کی رعایت سے۔۔ "دروغ اردو" کہا کرتے تھے۔ جب میں دفتر میں نہ ہوتا تو پوچھا کرتے۔ "فروغ اردو کدھر گیا۔"

سوائے شراب کی علت کے، میں نے اختر صاحب میں کوئی خرابی نہ دیکھی۔ وہ اپنے ملنے والوں کی عزت کرتے تھے۔ ان کی مدد کرتے تھے ان سے پیار کرتے تھے۔ غرض معصوم سے انسان تھے۔ جو اختر شیرانی کے نام سے معروف ہیں۔

مجھے آج بھی کبھی کبھی اختر صاحب یاد آجاتے ہیں ــــ وہ بھی مجھ سے وعدہ لیتے ہیں ؂

آپ بھولے تو نہ ہمیں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں

# شکیلہ اختر

تانگہ پر سے دو مستورات اُتریں۔ ایک برقع میں تھیں اور ایک بغیر برقع کے، بے پردہ خاتون نے تعارف کرایا۔ "یہ شکیلہ ہیں۔"

"آخاہ"۔ اور بڑی حیرت سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ حالانکہ پردہ والی خاتون سے مصافحہ کرنا عجیب لگا۔ مگر میں نہ جانے یوں کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔

شکیلہ نے تعارف کرایا۔ "یہ شہلا کی سہیلی رضیہ ہیں۔"

شکیلہ کون ہیں۔ پہلے یہ بتا دوں۔ پھر آگے چلوں — شکیلہ اختر میری منہ بولی بہن ہیں اور مشہور افسانہ نویس! برسوں سے ہم ایک دوسرے کے لیے بہن بھائی تھے۔ مگر آمنا سامنا پہلی بار ہوا۔

اب شکوے! آپ۔ وقت مقررہ پر پاکستان کیوں نہیں پہنچیں؛
جو تاریخ آپ نے لکھی تھی۔ اس دن میں اسٹیشن پر گیا تھا۔ تاکہ کسٹم وسٹم
کے چکر میں آپ کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑے۔ مگر آپ نہ آئیں۔ آج آئیں
بھی تو بغیر اطلاع کے۔"

"میں چاہتی تھی کہ بغیر اطلاع کے پہنچوں"

"آخر کیوں؟"

"اچانک ملاقات پر زیادہ خوشی ہوتی ہے نا!"

"ہوتی ہوگی" ـــــ یہ تھا شکیلہ کی سادگی کا پہلا وار جو خطا گیا۔

رضیہ کہنے لگیں۔ "ہم آپ، کا مکان ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے تھک
گئی ہیں۔ صبح سے ڈھونڈھ رہی ہیں۔ گڑھی شاہو کا ایک ایک کونہ چھان
مارا ہے۔"

"ٹیلیفون کرلیا ہوتا۔"

"وہ بھی کیا تھا۔ کوئی صاحب بولے تھے۔ طفیل صاحب ابھی
آئے ہی نہیں رہتے وہیں ہیں۔ جہاں سے آپ بول رہی ہیں ـــــ مجبوراً
دفتر آئی ہیں۔"

"اچھا تو پھر چلیے گھر۔"

چنانچہ ہم اسی تانگہ پہ گھر کی طرف چلے۔ راستے میں شکیلہ نے بتایا۔

رضیہ کہتی تھیں۔ تمہارا بھائی فراڈ ہے۔ گھر کا جو پتہ بتایا وہاں تو وہ رہتے نہیں۔ اس لیے واپس چلو"

میں نے ہنس کر کہا۔"رضیہ کا اندازہ غلط نہیں"

گھر کے پاس آکر میں نے تانگہ رکوایا تو رضیہ اور شکیلہ کے منہ سے مارے حیرت کے ایک ساتھ نکلا۔"ارے"

"کیا بات ہے؟"

"یہیں کھڑے ہو کر ہم نے آپ کا پوچھا تھا۔ مگر کسی نے بتایا ہی نہیں یہ جو آپ کے مکان کی بغل میں ڈاکٹر صاحب ہیں۔ یہ تو کہتے تھے۔ طفیل صاحب موچی دروازے میں رہتے ہیں"

"اچھا"

"جی ہاں"

"قصہ یہ ہے۔ میں کسی سے بولتا نہیں ہوں۔ شام آیا۔ صبح چلا گیا۔ یہ سب لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں۔ مگر کسی کو یہ معلوم نہیں۔ میں کون ہوں کیا کرتا ہوں۔ کیا نام ہے"

شکیلہ نے کہا۔"آپ نے اپنے نام کی تختی ہی لگائی ہوتی۔"

"یہ سمجھ کے نہیں لگائی۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا"

شان ٹپکتی ہے تو ٹپکے۔ ہم ایسے لوگوں کا تو برا حال نہ ہو۔"

سامان اوپر آیا۔ شکیلہ نے ایک دم گھوم کر سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ بڑی اترا کر رضیہ سے کہہ رہی تھیں۔ میرے بھائی کے پاس دو ریڈیو سیٹ ہیں۔ دو صوفہ سیٹ ہیں۔ یہ دیکھ الماری کتنی خوبصورت ہے۔ تصویریں دیکھو کتنی شاندار ہیں۔ غالباً یہ چغتائی کی ہے۔ غرض شکیلہ رضیہ سے بڑی شان میں باتیں کر رہی تھیں کہ میرا بھائی یہ ہے اور میرا بھائی وہ ہے اور وہ میں نہ مانوں۔ میں نہ مانوں کی تفسیر بنی شکیلہ کو چھیڑ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا۔ شکیلہ میں اتنی معصومیت ہے کہ بالکل پگلی معلوم ہوتی ہیں۔

شکیلہ بڑی گپ باز ہیں۔ اتنی کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی گپ باز خاتون کوئی نہیں دیکھی۔ مردوں میں بھی کوئی نہ دیکھا۔ یہ گھنٹوں ہی بول سکتی ہیں۔ ایک بات ماننی پڑتی ہے کہ ان کی باتیں بور قسم کی نہیں ہوتیں —— بہلاوے ہی بہلاوے ہوتی ہیں جس میں خلوص، معصومیت اور بیوقوفی سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اگر خلوص، معصومیت اور بیوقوفی (وہ آدمی شریف ہی نہیں جو بہ قدرِ ضرورت بیوقوف نہ ہو) میں سے ایک چیز بھی کم ہوتی تو شکیلہ کی باتوں میں اتنی دلکشی نہ ہوتی جو موہ لے۔ اپنا بنا لے۔

ایسا بھی ہوا کہ شکیلہ بول رہی ہیں (اپنی تینوں خصوصیات سمیت) اور بولتی چلی جا رہی ہیں اور میں حسبِ عادت کہیں اور پہنچا ہوا ہوں جھنجھلا کر

شکیلہ پوچھتیں "بھئی کہاں ہو؟"

"یہیں ہوں۔"

"میں بھلا کیا کہہ رہی تھی؟"

"بس یہی، کہ کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"میری باتیں غور سے سنو، روز روز میرا تمھارے پاس آنا نہ ہوگا۔ میں تمہیں دیکھنے کے لیے اتنی دور سے آئی ہوں اور تم ہو کہ ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے ہو۔ کیا میری باتیں تمھیں ناپسند ہیں؟"

"نہیں آپا نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"ایک بار انھوں نے میری اس حرکت پر، اپنی باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میں پریشان ہو گیا اپنی انا کی خاطر، شکیلہ سے کچھ نہ کہا۔ مگر مجھے محسوس ہوا۔ جیسے روح کی تسکین کے سارے دروازے بند ہو گئے ہوں۔

ایک صبح میں شیو کر رہا تھا کہ باورچی خانہ میں شکیلہ کی باتیں سنیں۔ عجیب باتیں تھیں وہ، میری بیوی سے کہہ رہی تھیں۔ "چوری میں بڑا مزا ہے۔"

"ہوگا۔ میں اس مزے سے ناآشنا ہوں۔"

"ہائے ہائے بڑے مزے ہیں۔"

"اچھا"

"تو بھی چوری کیا کر۔

"جب مجھے خود ہی سب کچھ مل جاتا ہے تو پھر میں کیوں چوری کروں۔"

"خاوند ہزار روپیہ اپنے ہاتھ سے دے دے مگر اس کی ایک اکنی چرانے میں ہزار روپوں سے زیادہ کا لطف ہے۔"

"یہ بات ہے تو میں بھی چرایا کروں گی۔"

"ہاں ہاں ضرور!"

اختر صاحب کو میری چوریوں کا سب علم ہے۔ وہ مجھ سے چھپا چھپا کے روپے رکھتے ہیں۔ تنخواہ لاکر تو مجھی کو دیتے ہیں۔ البتہ کتابوں کی رائلٹی یا امتحانوں کے پرچوں سے جتنا روپیہ آتا ہے۔ اُسے مجھ سے چھپا کر رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا۔ انھوں نے روپے رکھے، ہم نے موقعہ پاکر چُرا لیے۔ گھر میں شور مچ گیا۔ میرے روپے کس نے چُرائے ہیں۔ میں انجان سی بن کر کہتی "پتہ نہیں کس کم بخت نے چرائے ہیں۔"

ایک بار اختر صاحب کو پرچوں کی جانچ کا روپیہ آیا۔ فوراً ہی ان کے باہر جانے کا پروگرام بن گیا۔ انھوں نے نوٹ گن کر لفافے میں رکھ دیئے اور لفافے کے اُوپر لکھ دیا کہ اتنے روپے رکھے ہیں اور تالا بند کرکے چابی ساتھ لے گئے۔

میں نے ان کے جانے کے بعد، تالے کو چابی لگوائی۔ دس دس کے نوٹ نکال مزے کرتی رہی۔ اختر صاحب واپس آئے تو جب

شور مچ گیا۔ روپے کس نے چرا لئے ہیں۔ ہم نے حسبِ عادت کہہ دیا "ہمیں کیا خبر، آپ ہی بھول گئے ہوں گے۔"

کہنے لگے۔ "تو روز کہہ دیتی ہے کہ میں بھول جاتا ہوں۔ اب کے تو میں لفافے پہ لکھ کے گیا تھا کہ اتنے روپے ہیں۔ اب کے کیسے بھول گیا؟"

شامتِ اعمال میری ننھی بھانجی آ نکلی۔ اختر صاحب نے اس سے بھی پوچھا۔ میں سمجھتی تھی۔ یہ ذرا سی بچی ہے۔ اسے کیا خبر، مگر صاحب اس نے توتلی زبان میں، میری طرف اشارہ کر کے بتا ہی دیا "ماسی نے چرائے ہیں"

اتنی ہی باتیں ہو پائی تھیں کہ میں شیو کر کے باورچی خانہ میں گیا اور پوچھا "کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

دونوں ہنس پڑیں اور ہنستی ہی چلی گئیں۔

شکیلہ کا اپنا کوئی بچہ نہیں۔ اولاد کے غم نے بے چاری کو نڈھال کر رکھا ہے۔ بات بات پر رو دیتی ہیں۔ شکیلہ اپنی ذات میں، اگر ایک طرف دلچسپیوں کا مرقع ہیں تو دوسری طرف غموں کی پوٹ بھی۔ آزردہ خاطری کی کوئی ذرا سی بھی بات ہو جائے تو پھر چھم چھم ہی چھم۔

شکیلہ اپنی زندگی سے بڑی بےزار ہیں اور ساتھ ہی اتنی بے احتیاط کہ مصیبتوں کو خود دعوت دیتی ہیں۔ دکھ ہی دکھ جو جھیلے۔ مالی نہیں ذہنی دکھ

شادی کے فوراً بعد اختر صاحب بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری بھی مہلک، اختر صاحب ہسپتال داخل ہوئے تو یہ بھی چوبیس گھنٹے وہاں موجود، ڈاکٹر منع کرتے تھے مگر یہ نہ مانتی تھیں۔ کہتی تھیں، شوہر کے بعد خود جی کر کیا کروں گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ختم کرنے کی ایک ترکیب سوچی، وہ یہ کہ پاس کی وارڈ میں جو سب سے خطرناک مریضہ تھیں، اُن کی تیمارداری میں دن رات جُٹی رہتیں۔ اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتیں، ساتھ لیٹ جاتیں۔ مریضہ حیران کہ لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ مگر یہ ہیں کہ یوں مجھ پہ قربان ہیں۔ بات ہی عجیب تھی۔ کہ موت کے کنارے کھڑے ہونے والے لوگ صحت کو ترس رہے تھے اور جو صحت مند تھے۔ وہ موت چاہتے تھے۔

شکیلہ کو پھولوں کا بے حد شوق ہے۔ انھوں نے گھر پہ طرح طرح کے پھول لگا رکھے ہیں۔ دن رات ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں اور خوش رہتی ہیں۔ انھیں اس حد تک پھول خولیا ہے کہ کبھی کبھی اختر صاحب سے بھڑ جاتی ہیں۔ وہ بھی سوچتے ہوں گے کہ کسی بھی چیز سے اتنا پیار اچھا نہیں ہو سکتا۔"

ایک دن ہم لارنس گارڈن گئے۔ بہار کے دن، پھول اپنے جوبن پر، شکیلہ انھیں دیکھ کر کھِل اٹھیں۔ باغ کی اور پھولوں کی بے حد تعریف کرتی رہیں۔ ایک جگہ رُک کر پوچھنے لگیں۔ "طفیل اس پھول کا

نام بتاؤ!"

"مجھے کیا معلوم۔"

"اس کا یہ نام ہے۔"

"بھلا اس کا؟"

"بھئی مجھے کچھ پتہ نہیں"

"اچھا تو جناب مزے اڈیٹر ہیں۔"

"جتنی دیر ہم باغ میں رہے۔ شکیلہ نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول ہمارے ہاں بھی ہیں۔ ان پھولوں کی خوشبو بڑی اچھی ہوتی ہے۔ یہ پھول بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ پھول بہت کم ہوتے ہیں ـــ آہاہ یہ پھول کتنے خوبصورت ہیں۔ بھئی واہ وا۔

پھلوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ جتنے دن یہ ہمارے ہاں رہیں میں پھل منگواتا رہا۔ یہ انہیں ہاتھ ہی نہ لگاتیں۔ میں انہیں کہتا۔ یہ کھائیے۔ اونہہ ـــ یہ کھائیے۔ اونہہ ـــ ایک دن میں نے عاجز آ کر کہا۔ اچھا کل میں آپ کے لیے اونہہ پھل ہی لاؤں گا۔ اس پر بے اختیار ہنسیں۔ مگر پھلوں کو ہاتھ نہ لگایا۔

میں نے پوچھا "آپ کو کوئی بھی پھل پسند نہیں؟"

"نہیں تو۔"

"کون سا؟"

"کھیرے گکڑیاں"۔

میں اتنے زور سے ہنسا کہ میرے پھیپھڑوں کو سانس بھر کی ورزش ہو گئی۔

"بھئی ہنسے کیوں جا رہے ہو؟"

"جسے آپ پھل کہہ رہی ہیں۔ وہ تو ترکاریاں ہیں"۔

"اچھا"۔

اچھا سے ایک بات یاد آئی۔ شکیلہ کا تکیہ کلام "سمجھا" اور "اچھا" ہے۔ سمجھا زیادہ، اچھا کم۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ بھاری لفظ کو بڑا کھینچ کے بولتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شبہ ہوتا ہے۔ جیسے یہ ترنّم میں کچھ کہہ یا گا رہے ہوں۔

اب آپ اُن کی گفتگو سنیں:۔

"سم جھا (سمجھا) صبح اٹھی تو طبیعت خراب تھی سم جھا۔ تھوڑی سی چائے پی۔ سم جھا۔ دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ سم جھا"۔

اب اس شعر کا دوسرا مصرع سنیے۔ جب یہ کسی کی گفتگو سنتی ہیں تو یوں ساتھ دیتی ہیں "اچھا" کے لفظ کو خوب کھینچ کے پڑھے گا۔

"اچھا" صرف اُن کا ہوتا ہے۔ باقی سب مخاطب کا۔

"میں صبح دفتر پہنچا ـــ اچ چھا ـــ دیکھا تو فلاں دوست بیٹھا ہے۔ اچ چھا ـــ اس نے کہا بھئی ہمارا یہ کام چل کے کرا دو۔ اچ چھا ـــ"

جب یہ خود بول رہی ہوں تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ وہ بیچ میں بول سکے (کم از کم میری تو مجال نہیں) جب کوئی دوسرا بول رہا ہو۔ پھر بھی کسی کی مجال نہیں کہ وہ ہر فقرے کے بعد "اچ چھا" سنے بغیر آگے بڑھ سکے۔ انھیں باتیں سننے کا شوق ہے۔ باتیں کرنے کا شوق ہے سنانے کا زیادہ سننے کا کم، ادھر میں ایسا بدھو نہ سننے کا شوق، نہ سنانے کا۔ میرا خیال ہے شکیلہ مجھ سے مل کر قطعاً خوش نہ ہوئی ہوں گی۔

ایک رات میرے چھوٹے بھائی کو یہ سوجھی کہ کل شکیلہ آپا چلی جائیں گی۔ اس لیے آج کی رات جاگ کر کاٹی جائے۔ پہلے بھی رات کو گیارہ بجے تک باتوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس لیے میں نے ناک چڑھا دی۔

بھائی نے کہا۔ "تاش کا پروگرام رہے۔"

شکیلہ بولیں۔ "سم جھا! طفیل آج تاش ہو گی۔"

"مجھے نہیں آتی۔" پھر شکیلہ ہی کے انداز میں سر کے ساتھ) "سم جھی؟" بہرحال دھر لیے گئے۔ بڑی بہن تھیں (شکیلہ مجھ سے سات برس

بڑی ہیں) انکار نہ ہو سکا۔ بیٹھ گئے۔ میں اور میرا بھائی پارٹنر، شکیلہ اور میری بھابی پارٹنر، خوب خوب ہاتھ ہوئے۔ شکیلہ کو یہ گھمنڈ تھا، میں عمدہ کھیلنے والی ہوں۔ اس لیے میرے مقابلے میں کوئی کیا جیتے گا۔ ادھر اپنی قسمت میں، کسی بھی معاملے میں، خدا نے ہار لکھی ہی نہیں۔ اس لیے مات ہوتی تو کیسے ہوتی۔

شکیلہ اور میری بھابی کا پلتے پیٹتے بُرا حال ہوگیا۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ نیند نے اپنی کارستانی زوروں پر شروع کر دی۔ میں جماہیوں پر جماہیاں لے رہا تھا۔ مگر ان پٹنے والی، اللہ کی بندیوں نے مجھ پر ترس نہ کھایا۔ مجبور ہو کر میں نے بیگم کو آواز دی۔

"اے نیک بخت، چائے بنا کر پلا دے۔"

"میں نہیں اُٹھ سکتی۔"

"اری اُٹھ جا، جنت میں مکان ملے گا۔"

"مجھے نہیں چاہیئے، جنت میں مکان!"

"یہ دیکھ سو روپیہ۔ بطور انعام لے لے، مگر اس وقت اُٹھ کر چائے بنا دے۔"

"مجھے نہیں چاہیئے سو روپیہ۔"

شکیلہ بولیں۔ اری کم بخت سو روپیہ مل رہا ہے۔ اُٹھ کر جلدی سے

چائے بنا دے۔ اگر طفیل مجھے دس روپے دینے کا وعدہ کرے تو ابھی اٹھ کر
چائے بنا دوں۔"

خیر چائے نہ دس روپے لینے والی نے بنائی، نہ سو روپیہ پانے والی
نے، ہم کھیلتے رہے اور صبح تک کھیلتے رہے۔

شکیلہ کو کھانے پینے کی چیزوں سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ ہزار نعمتیں
ان کے سامنے رکھ دیجیے۔ قطعاً لطف اندوز نہ ہوں گی ـــ کھائیں گی تو
وہ بھی اتنا، جتنا کہ ایک برس کا بچہ 'بغیر ڈکار لیے کھا لے۔

ایک دن یہ مجھ سے گویا ہوئیں۔ طفیل آج بہت زیادہ کھا لیا ہے
کباب اچھے تھے۔ سالن بڑا مزے دار تھا۔"

"چلو اچھا ہوا آج آپ نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔"

بلکہ آج تو دو دن کا اکٹھا کھا لیا۔"

"آخر کتنا کھایا؟"

"بھئی ڈیڑھ چپاتی کھا گئے۔"

کھانے کا حال تو آپ نے سن لیا۔ اب ذرا چلنے پھرنے کا بھی حال
سن لیں ـــ آج ہم بہت پیدل چلے۔ بہت پیدل چلے۔ بس تھک گئے۔"

"آخر کتنے میل؟"

"بھئی ہم انار کلی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک

پیدل ہی تو چلتے چلے گئے۔"

یہ سارا فاصلہ کوئی دو فرلانگ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس لیے میں نے بلائیں لے لیں۔ تاکہ میری بہن کو کہیں نظر نہ لگ جائے۔

شکیلہ کو نقادوں سے بڑی شکایت ہے۔ کہتی ہیں۔ نقاد بھی گروہ بندی کا شکار ہیں۔ پھر ایک نقاد دوسرے نقاد کے پیچھے ہی چلا جا رہا ہے۔ ناک کی سیدھ میں، خود سے کچھ سوچتا ہی نہیں نہ کوئی نئی بات ہی کہتا ہے۔ ہر نقاد تبصرہ نگار ہے۔ تخلیقی تنقید کسی کے ہاں نہیں۔ انھوں نے خواتین افسانہ نگاروں کے ساتھ عموماً زیادتی کی ہے۔ انھیں بس دو تین نام ہی یاد ہیں۔ لے دے کے انھی کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً عصمت، ہاجرہ، خدیجہ اور بس۔ حجاب کو بھی کوئی زیادہ لفٹ نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ اپنے اسٹائل اور پختگیٔ فن کے اعتبار سے منفرد اور جاندار ہے۔ تسنیم سلیم چھتاری کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ حالانکہ اس کے فن میں جتنا خلوص ہے وہ کسی کو بھی نصیب نہیں۔ مگر نقاد جب بولتا ہے۔ یہی کہتا ہے۔ عصمت، ہاجرہ اور خدیجہ۔"

میں نے چھیڑا۔ "آپ نے اپنا نام نہیں لیا؟"

"بھئی ہم کیا ہیں؟"

"خواتین!"

"ہاں "خواتین" تو ہیں۔ مگر افسانہ نگار نہیں ہیں۔"

"جس طرح آپ خاتون ہیں اور افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اسی طرح باقی افسانہ نگار خواتین نے بھی نقادوں سے کہہ رکھا ہے کہ ہم عورت ہیں۔ افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا تذکرہ افسانہ نگار خواتین کے ساتھ نہ کیا جائے۔"

یہ بات ہے تو کیا عصمت، ہاجرہ اور خدیجہ نے نقادوں سے کہہ رکھا ہے کہ ہم افسانہ نگار ہیں؟"

"ہاں ہاں انھوں نے ضرور کہا ہوگا۔ ورنہ نقادوں کو پتہ نہ چلتا کہ خواتین بھی افسانہ نگار ہوسکتی ہیں۔ یہ لوگ کان سے کام لیتے ہیں۔ ذہن سے نہیں۔"

"اب دیکھو جیلانی بانو کتنے اچھے افسانے لکھتی ہے۔ مگر نقاد چپ ہیں۔ بولیں گے تو اتنے، ایک نئی لکھنے والی جیلانی بانو بھی ہے۔ چھی چھی چھی!"

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی باتونی کیوں نہ ہو۔ شکیلہ کو اس سے یہی شکوہ ہوگا کہ آپ بڑے چپ چپ رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن مجھ سے ــــ "مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ آپ بالکل چپ شاہ ہیں۔ آپ کی خاموشی نے تو مجھے بالکل بور کر کے رکھ دیا ہے۔ اب یہ طے کیجیے کہ ہم گھڑی سامنے رکھ کر باتیں کریں گے۔ ایک گھنٹہ تم بولو۔ ایک گھنٹہ میں بولوں گی۔"

میں نے سراسیمہ ہو کر اس کے جواب میں کہا تھا "آپا آپ ہی

بولتی جاتیں۔ مجھے حالات نے بولنا سکھایا ہی نہیں۔"

"اب تو آپ کے حالات بڑے اچھے ہیں۔"

"میں ماضی کی بات کرتا ہوں۔ بچپن ہی میں آدمی بولنا سیکھتا ہے۔"

"اب چھوڑو بھی ماضی کو۔"

"جس دن میں نے ماضی کو پیشِ نظر نہ رکھا۔ اس دن میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"چلو ہٹو۔ بکواس نہ کرو۔"

"پھر میرے حالات بھی کون سے زیادہ اچھے ہیں۔"

"بڑے بے ایمان ہو تم۔"

اس طرح باتوں باتوں میں شکیلہ نے مجھے بکواسی، بے ایمان تک کہا۔ یقین مانیے۔ میں یہ سب کچھ بن کر بھی بے حد خوش ہوں۔ اس لیے کہ ان میں بہن کا پیار ہے۔ خلوص ہے۔ کوئی اور مجھے اب کہہ کر تو دیکھے میری غیرت کو کیا کیا جوش نہیں آجاتا۔

میں نے سنا تھا کہ شکیلہ نے اپنی شادی کے فوراً بعد، اپنا سارا زیور بیچ، روپیہ غریبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ اچنبھے کی ہے اس لیے کہ آج کل ایسے لوگ کہاں، یہ بات تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں

کی تھی۔

میں نے باتوں باتوں میں شکیلہ سے پوچھا تھا۔ آج کل آپ کے من بھاتے مشاغل کون کون سے ہیں؟ جواب ملا۔ "یوں تو کچھ نہیں ——— گھر گھر جاکر چندہ ضرور اکٹھا کرتی رہتی ہوں۔"

"کس لیے؟"

"اس لیے تاکہ اردو کے چند ایک اسکول چلائے جاسکیں۔ اگر ادھر توجہ نہ دی گئی تو پھر پندرہ بیس برس کے بعد بھارت میں اردو جاننے والا کوئی نہ ہوگا۔"

یہ بھی باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ان کے ہاں قیمتی چیز کوئی نہیں؛ اس لیے کہ ضرورت مند لوگ میاں بیوی کو گھیرے رہتے ہیں۔ نقد روپیہ ایسے "فضول خرچ" لوگوں کے پاس رہتا کہاں ہے۔ جو ان کے پاس رہتا۔ اس لیے جتنا بھی قیمتی سامان تھا۔ وہ بھی سب کام آگیا۔

اتنا درد مند دل، جو غریبوں اور محتاجوں کے لیے عملی ہمدردی رکھتا ہو کسی اور کو کاہے کو نصیب ہوا ہوگا ——— ایک دن اخبار سامنے آیا تو میں نے موٹی موٹی سرخیاں دیکھ کر چھوڑ دیا۔ انھوں نے پڑھا تو مجھ سے کہا۔

"بھئی کچھ پڑھا؟"

"کیا؟"

"دوستو":-

"ایک جوڈیشل مجسٹریٹ کے بارے میں خبر آئی ہے کہ
انھوں نے شقاوت و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے
مجسٹریٹ صاحب ایک روز سو کر جو اُٹھے تو اُن کے ہاتھ
کی گھڑی گم تھی۔ بہت تلاش کی گئی۔ لیکن گھڑی نہ ملی مجسٹریٹ
صاحب کو اپنے گھر کی ملازمہ پر چوری کا شبہ ہوا۔ چنانچہ
انھوں نے اس کو اتنی بے دردی سے مارا کہ وہ اپنی
جان بچانے کی خاطر اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر
ہی میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے
نوکرانی کے بھاگ جانے پر اس کے تینوں بچوں کو تختۂ مشق
بنانا شروع کیا اور اس اقبال جرم کی مہم میں ایک مقامی
تھانیدار کی امداد بھی حاصل کر لی۔ ان بچوں کی پٹائی سے بھی
کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ان کے اختراع پسند ذہن نے
ایک انتہائی وحشیانہ سزا ایجاد کی کہ تینوں بچوں کے جسم
میں کیلیں ٹھونکنی شروع کر دیں۔ بچوں کی عمریں علی الترتیب
سات سال، پانچ سال اور تین سال تھیں۔ بچے اس سزا کی
تاب نہ لا کر چیخیں مارتے مارتے بے ہوش ہو گئے۔ ان کی

چیخیں اتنی بلند اور دل دوز تھیں کہ آس پاس کے لوگ موقع
پر جمع ہو گئے اور ہجوم میں شاید اشتعال اور غم و غصہ پیدا ہو گیا
اور فساد کا اندیشہ ہونے لگا۔ اتنے میں ایک مقامی پولیس
کا ایک دستہ موقع پر پہنچ گیا۔ اور اس نے بچوں کو تو فوراً
ہسپتال پہنچایا اور ہجوم کو سمجھا بجھا کر منتشر کیا۔ ہسپتال جا کر
معلوم ہوا کہ سات سالہ لڑکی کے جسم میں ۲۶ کیلیں ،
پانچ سالہ لڑکے کے جسم میں ۱۲ کیلیں اور تین سالہ بچی کے
جسم میں تین کیلیں ٹھونکی گئی تھیں۔"

یہ خبر سن کر میں نے کہا۔ "توبہ توبہ ظلم کی انتہا ہو گئی۔"
شکیلہ نے کہا۔ "یہ خبر ابھی ختم کہاں ہوئی ہے۔ آگے لکھا ہے۔"
"لطف یہ کہ اس سارے ظلم و شقاوت کے بعد تلاش کرنے
پر گھڑی خود مجسٹریٹ صاحب کے تکیہ کے نیچے سے برآمد ہوئی۔"

جس دن شکیلہ کو ہندوستان واپس جانا تھا۔ انھوں نے صبح ہی صبح
شور مچانا شروع کر دیا۔ طفیل جلدی جلدی دفتر جاؤ اور پھر جلد ہی واپس آجاؤ۔
میرا خیال یہ تھا۔ بہن واپس جا رہی ہے۔ اس لیے آج دفتر ہی نہ جاؤں۔
چائے پینے کے بعد یہ اصرار پھر بڑھ گیا۔ "جاتے کیوں نہیں۔"
مجبوراً اٹھا کئی بار قدم رکے بھی، کہ آج نہ جاؤں۔ یوں گو مگو

کے عالم میں کھڑا ہی تھا کہ پھر شکیلہ کی آواز آئی "جاتے کیوں نہیں ہو؟ دھوپ تیز ہو رہی ہے۔"

مجبوراً آفس چلا گیا۔

ان کی گاڑی دو ڈھائی بجے چھوٹتی تھی۔ بارہ بجے گھر واپس آیا تو شکیلہ قدرے خفا، میں حیران "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھا محترمہ اس قدر خوشش کیوں ہیں؟"

"تم بڑے سنگدل ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہیں علم تھا کہ میں آج واپس جا رہی ہوں پھر بھی تم دفتر چلے گئے۔"

"میں کہاں جاتا تھا۔ آپ نے ہی تو دھکے مار کے نکالا تھا۔"

"میں تو بار بار اس لیے کہتی تھی۔ تاکہ تم جلدی سے یہ کہہ دو کہ میں آج نہیں جاتا۔ مگر تم میرے دل کی بات سُنے بغیر، میری زبان پر ہی اعتبار کر کے چلے گئے۔"

کھانا وانا کھانے کے بعد سامان تانگے میں رکھا جا رہا تھا۔ بچوں سمیت سب حیران اور چپ تھے کہ شکیلہ آپا کیوں جا رہی ہیں۔ ان کا ایک سوٹ کیس، میں نے بھی سیڑھیوں سے اتارا۔ یقین کیجیے وہ سوٹ کیس مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے کسی عزیز کی میت اٹھائے سیڑھیوں

سے اُتر رہا ہوں۔

شکیلہ ہمارے ہاں میری بہن اور میرے گھر والوں کی مہمان بن کر آئی تھیں۔ مگر شکیلہ کی باتوں نے، خلوص نے، محبت نے، سب کو اپنا بنا لیا۔ اب میری یہ انفرادیت ختم ہو گئی کہ شکیلہ صرف میری بہن ہیں۔ اب جسے دیکھو وہ شکیلہ ہی کی باتیں کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کو یاد کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کے غم میں گھُلا جا رہا ہے۔ عجیب جادوگرنی ہیں یہ، جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ جیت لیا۔

شکیلہ کو بے شمار لوک گیت یاد ہیں۔ ایک دو نہیں، ہزاروں گیت، ایک دن میں نے فرمائش کی "آپا، آج کچھ لوک گیت تو سنائیں ــــ کہنے لگیں، مجھے کوئی ڈیڑھ ہزار کے قریب لوک گیت یاد ہوں گے۔ یہ فرمائش کر کے کیوں اپنا وقت برباد کرتے ہو ــــ میں نے جواباً کہا۔ تو پھر ہو جائے آج وقت برباد، چنانچہ شکیلہ نے کچھ لوک گیت لَے کے ساتھ سنائے۔ ساتھ ساتھ بتاتی جاتی تھیں۔ اس گیت کو ٹونا کہتے ہیں۔ اسے شہانا کہتے ہیں اور اسے جوگ، اللہ جانے یہ ٹونا، شہانا اور جوگ کیا بلا ہوتے ہیں۔ بہرحال ان میں سے چند گیت یہ ہیں۔ جو مجھے بے حد پسند آئے۔

(ٹونا) دُوری سے چلا بنا آیا، اری اماں نت کرو ٹونا

اپنے غرض دَوڑا آیا، اری اماں نت کرو ٹونا

ٹونا سے دُلہا بورایا، ٹونا سے دلہا ریجھایا

اری اماں نت کرو ٹونا

ایک ٹونا، سہرے اُوپر بھیجا، جو دلہے کی سریوں سے لاگا

جو دلہے کی انکھیوں سے لاگا

اری اماں نت کرو ٹونا

(۲)

عرض میری ماں، پی کو ٹونا نہ کیجیو

منت میری ماں، پی کو ٹونا نہ کیجیو

پیا ہے میرے بس میں، ری ماں

پیا ہے پاؤں دبنا، ری ماں

پیا ہے پنکھا جھلنا، ری ماں

پی کو ٹونا نہ کیجیو عرض میری ماں

پی کو ٹونا نہ کیجیو

سنو جی میری ماں پی کو ٹونا نہ کیجیو

(شہانا)

کیا لایا۔ کیا لایا؟ لاڈو کا ٹیکہ لایا ٹیکے میں متیا لا رے محلوں میں میرے
بانکا شہزادا آیا رے محلوں میں میرے دیکھو شہزادا آیا رے محلوں میں میرے

کیا لایا کیا لایا، لاڈو کا جوڑا لایا۔ جوڑے میں گھونگھٹ لایا رے محلوں میں میرے

بانکا شہزادہ آیا رے محلوں میں میرے

بانکا سُسروا آیا رے محلوں میں میرے

(۲)

ملنگے ٹیکہ پہن کے آنگن میں سو رہیں رے لال

آنگن میں لال، بنسیا بجائے چھوٹا دولہا

آنگن میں لال گوری کو منائے نیا دولہا

ناک بیسر پہن کے آنگن میں سو رہیں رے لال

آنگن میں لال، لاڈو کو ہنسائے میاں بندرا

آنگن میں لال گوری کو منائے نیا دولہا

آنگن میں لال بنسیا بجائے میاں بندرا

(۳)

اے شہانے بنے میرے بنگلے مت آنا جی

بنگلے میں میرے دادا بیٹھے ہیں بنگلے میں نانا کھیا بیٹھے ہیں

شہانی لاڈو آئیں گے زورہ بالا زوری جی: ہمارا کوئی کیا رے کرے گا؟

دادا کو تمرے بندگی بھیجیں گے

نویلے بنے، میرا ٹیکہ مت چھوؤ جی۔ ہتھیلیوں کی میل لگے گی۔

سُہانی لاڈو، چھوئیں گے زور بالا زوری جی

ہمارا کوئی کیا رے کرے گا

لاڈو کو اپنے بندی بیہیں گے۔

(جوگ)

دادی ہماری اصلی جوگنیاں، دادا ہیں جوگی کے سنگ،

سُہانے بنے جوگ چلایا، جوگ چلایا آدھی رات، نویلے بنے جوگ چلایا،

جوگ چلے ہے، ساری رات لاڈو کے بنے جوگ چلایا۔

(۲)

جوگ سے دلہا ریجھایا، رے اتوار منگل کو

جوگ سے دلہا بورایا، رے اتوار منگل کو

جوگ کا سہرا بنے کو بندھایا

جوگ کا جوڑا بنے کو پہنایا

ارے جوگ کا بیڑا چبھایا رے اتوار منگل کو

لاڈو کا بندرا ریجھایا رے اتوار منگل کو

(بال سنوارنے کے وقت کے گیت)

بنے ٹیکہ جو لایا جھالر کے، بنوی سنوارو لمبے بال

جھوکی جھوکی سنوارو لمبے بال، میاں بندرا جو آیا لگن دھرے کو

نیا دلہا جو آیا لگن دھرے کو ــــــ!

(رُونمائی کے وقت کا گیت)

چندا مکھ دیکھو ری، میری لاڈو سہاگ بھری

سہاگ بھری، موتی مانگ جڑی،

چندا مکھ دیکھو ری، میری لاڈو سہاگ بھری

(کوہبر یعنی حجلۂ عروسی کے گیت)

ٹیکہ بھی دوں گی بنے موتیا بھی دونگی

سچّے موتی میں ہاتھ لگانے نہ دُوں

میاں بندرے پلنگ بیچ آنے نہ دوں

نئے دلہے پلنگ بیچ آنے نہ دُوں

(۲)

بجلی کا ٹیکہ جھلائل، تیرے پہنائے نہ پہنوں۔

ہزریا لال، تیرے منائے نہ مانوں

کیسریا لال، تیرے منائے نہ مانوں

چھاپے کا جوڑا جھلائل، تیرے پہنائے نہ پہنوں

شہانے لال تیرے منائے نہ مانوں

ہزریا لال تیرے منائے نہ مانوں

ایک دن جو پھر ان کی باتوں والی مشین چلی تو انھوں نے کہا کہ ——"میں نے فلاں لڑکی کو ایم۔ اے پاس کرا دیا۔ فلاں لڑکی کو بی۔ اے کی تیاری کرائی"——

اس پر میں نے پوچھا ——"آپا آپ خود تو میٹرک بھی نہیں۔ مگر یہ ایم۔ اے کی تیاری کا کیا مطلب؟" —— کہنے لگیں ——"ہاں یہ تو ٹھیک ہے کہ خود تو میٹرک بھی نہیں ہوں۔ مگر اردو کی کئی طالبات کو میں نے ایم۔ اے کرا دیا ہے"

اس پر میں نے چھیڑا ——"اچھا تو آپا، مجھے بھی ایم۔ اے کرا دیجئے"

"ارے پگلے —— تمھیں تو وہ پڑھائے جس کا خود اپنا دماغ خراب ہو"

"یہی وجہ ہے کہ میں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں"

"اچھا —— اچھا —— تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں پاگل ہوں"

"یہ کون کافر کہتا ہے۔ خاکسار تو صرف پڑھنا چاہتا ہے اور ایم۔ اے پاس کرنا چاہتا ہے"

"نہ بھئی نہ، میں تم ایسے چلتر کو نہیں پڑھا سکتی"

میں چلتر کیسے ہو گیا؟

میں پاگل کیسے ہو گئی؟"

بوا اپنے علاقے کے بڑے زمینداروں میں سے تھیں۔ مگر جب سے حکومت ہند نے بڑی بڑی زمینداریوں کو ختم کیا۔ ان کے بھی وہ ٹھاٹھ نہ رہے مگر عادتیں وہی، آج بھی ان کے ہاں کوئی تیس چالیس نوکر ہوں گے۔

بیس پچیس نوکرانیاں، جنھیں شکیلہ اپنی رعایا کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بھی خود نہیں اُٹھتیں۔ بلکہ بیٹھے ہی بیٹھے حکم چلاتی رہتی ہیں۔ اری سنو ــــ ارے سنو! ــــ شاید یہی وجہ ہے کہ صحت بڑی شاندار ہوتی جا رہی ہے۔ بھئی ویسی ہی صحت، جیسی مالدار لوگوں کی ہُوا کرتی ہے۔ یعنی موٹاپا۔

موڈ میں ہوں گی تو ایک ہی وقت میں کئی کئی کام ایک ساتھ شروع کر دیں گی۔ کپڑے بھی سی رہی ہوں گی۔ کھانا پک رہا ہے تو دیگچی میں چمچہ بھی چلا دیں گی۔ دھوبی یا درزی سامنے آگیا ہے تو اُس غریب کو ڈانٹ بھی پلا دیں گی ــــ اور اس کے ساتھ وہ افسانہ بھی چل رہا ہے۔ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے شروع ہُوا تھا۔ جس کی ہیروئن ایک غریب دیہاتی لڑکی تھی۔ اور جو ہر طرح کی ہمدردی کی مستحق تھی ــــ اپنے ٹھاٹھ باٹھ سارے امیرانہ۔ مگر دل میں غریبوں کے لیے بے پناہ ہمدردی،

شکیلہ بڑی حیا والی ہیں۔ بڑی محتاط گفتگو کرتی ہیں۔ کسی ایسے لفظ کو زبان سے نہیں نکالتیں۔ جو ذرا بھی شرافت کے دائرے سے نکلتا ہُوا ہو۔ ورنہ آج کل تو خواتین بھی ایسی ایسی گفتگو کرتی ہیں کہ مرد منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ بات فیشن میں داخل ہوتی جا رہی ہے کہ مردوں کے سامنے، ہر طرح کی آزادانہ گفتگو ہی کو "کلچرڈ" ہونے کی نشانی سمجھا جانے لگا ہے۔

شکیلہ نے ایک دن مجھے کہا۔ "میرا افسانہ منزل پڑھ لیا؟"

"ابھی تو نہیں پڑھا۔ اب آپ آگئی ہیں تو خود ہی سُنا دیجیے گا۔"

"نہ بابا نہ۔"

"کیوں"؟

"بھئی اس میں چند ایک باتیں ایسی لکھی ہوئی ہیں۔ جو ایک بہن، بھائی کے سامنے نہیں پڑھ سکتی۔"

یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں۔ حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ بہن تو بس بہن ہی ہوتی ہے۔ سگی، سوتیلی، منہ بولی، یہ سارے ہی اضافی اور فضول لفظ ہیں۔ جب کہ خون کے رشتے کی بات بھی، میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔

یہ سیّدہ ہیں۔ وہ بھی اصلی، براہِ راست رسولِ مقبولؐ کی چوبیسویں پشت میں، اس لیے قلم رکھتا ہوں۔ توبہ استغفار کرتا ہوں۔

# مُدیرِ نقوش

میرے بارے میں کسی نہ کسی طرح دو رائیں بنتی چلی گئیں۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں اور یہ ان کے دل کی فیاضی ہے۔ بعض لوگ مجھے دشنام سے یاد کرتے ہیں اور یہ ان کے دل کی ناراضی ہے۔ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں۔ اس کا فیصلہ آج نہیں کل ہوگا۔ میں نے اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے —— یہ اوراق انھیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ میں کتنا بُرا اور کتنا اچھا ہوں۔

(ابوالکلام)

آج میں آپ کی اُن حضرت سے ملاقات کراتا ہوں جو اس سے پہلے اپنے کئی دوستوں کی پگڑیاں اچھال چکے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے رہے ہیں کہ میں صاف گو

قسم کا انسان ہوں۔ ارادہ ہے آج انھیں بھی صاف گوئی کی کسوٹی پر رگڑ دیا جائے۔
صورت دیکھیے تو مسکین بھولے بھالے، تجربتہً اس کے برعکس، میں انھیں ۱۵ر اگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ حضرت اب تک چکمہ دیئے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا؟
مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں ان کا بچپن کا دوست ہوں۔ اُس وقت کا دوست، جب یہ بجائے چلنے کے رینگا کرتے تھے اور امّی اوچی کہہ کر روٹی مانگا کرتے تھے۔

بعض ناسمجھوں کا خیال ہے کہ جنابِ طفیل ایسے شریف آدمی اگر پیدا ہونے بند نہیں ہوئے تو کمیاب ضرور ہو گئے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ اب تو ایسا برانڈ آتا ہی نہیں۔ یہ بھی اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو نقصان کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض بے تکلف دوست انھیں بے ضرر اور غیر مفید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ جوں جوں بڑھتے گئے۔ والد کی مسلسل اور جان لیوا بیماری کی وجہ سے غریبی جوان ہوتی گئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیچارے کی تعلیم ادھوری رہی۔ انھیں ہائی سکول میں پڑھتے تو دیکھا گیا ہے۔ مگر ان کے پاس کوئی قابلِ ذکر تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے اکثر یہ فقرہ سننے میں آتا ہے — اجی

سرٹیفکیٹ کو چھوڑیئے۔ آج کل تو سکولوں اور کالجوں میں جہالت کے سرٹیفکیٹ بٹتے ہیں۔

ان کی تیسری جماعت کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔ جب یہ حضرت اوّل درجہ کے کُند ذہن ہوا کرتے تھے اور خوب پٹا کرتے تھے۔ اگر اُستاد نے گھر پر کرنے کے لیے کام دیا تو یہ پٹائی سے بچنے کے لیے اپنے ہی ہم سبقوں کے گھروں پر جاکر، انھیں باتوں میں لگا کر، آنکھ بچاکر، یا اُن کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھاکر، اس دن کا کام کیے ہوئے صفحات ہی پھاڑ لایا کرتے تھے۔ اس طرح خود سرخرو ہوکر دوسروں کو مصیبت میں ڈال دیا کرتے تھے اور اُستاد اُن بیچاروں کو یہ کہہ کہہ کر خوب پیٹا کرتے تھے ——"ہُوں، کسی نے کاپی میں سے صفحے پھاڑ لیے ہیں —— شاڑ —— ہوں کاپی میں سے صفحے —— اُتو ایک تو کام نہیں کرتے دوسرے جھوٹ بولتے ہیں۔

ایک دن، ان کا ایک ہم سبق، ان کے ہاتھ کی صفائی سے پٹ رہا تھا تو یہ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اُٹھے اور اقرار کر لیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ صحیح ہے اور قصوروار میں ہوں۔ استاد نے ان کی صاف گوئی کی کوئی قدر نہ کی۔ الٹے اتنی ٹھکائی کی کہ اسکول کی دیواریں تک سہم گئیں تب سے نہ جانے کیا ہُوا کہ یہ پڑھائی میں تیز ہوگئے۔ اتنے تیز کہ اُستاد ان پہ فخر کرنے لگے۔

ان کی اس سے بھی پہلے کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ جو ممکن ہے اس

ان کے لیے وجۂ فضیلت نہ ہوں۔ مگر وہ باتیں ان کے مستقبل کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد دے ہی سکتی ہیں۔ یہ اپنے ماضی کی یادوں کو یکسر بھلا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ہیں کہ انھیں یاد آہی جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی جھنجھلا کر یہ شعر بھی دہراتے ہوئے پلٹے گئے ہیں ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ابھی یہ چار پانچ برس ہی کے ہوں گے کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی خوب گت بنوائی۔ رُوئے، پیٹے اور کُپّا۔ گھر والوں نے جناب کی یہ حالت دیکھی تو بھڑوں کے چھتّے کو جلا ڈالا کوئی دو مہینے بعد بھڑوں نے پھر وہیں ڈیرے ڈال دئے۔ انھوں نے دوبارہ چھتّے میں ہاتھ ڈال کر اپنا حلیہ حسبِ سابق بنا لیا۔ آج جبکہ اس واقعہ کو تیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ انھوں نے بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت ترک نہیں کی۔

اِنہی دنوں کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ جب یہ حضرت ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی ممانی کے ہاں ڈاکہ ڈالا۔ وہ بیچاری سب سے چھُپ کر، چارپائی کے نیچے، زمین میں سوراخ کرکے اور اُس میں مٹّی کا ایک چھوٹا سا آبخورا گاڑ کر پیسے جوڑا کرتی تھیں۔ یہ حضرت رینگتے،

دھڑاتے، چلتے موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ ڈھکن اٹھایا، پیسے نکالے، مٹھی میں دبائے۔ برآمدے میں پہنچے تو بڑے بچوں نے چھین جھپٹ کر خوب مزے کیے۔

چند دنوں کے بعد یہ حضرت پھر اُسی دفینہ پر جتنے بھی پیسے ہاتھ آئے۔ نکال لائے۔ ممانی نے موقعہ پر ہی چور کو پکڑ لیا۔ خوب پیٹا۔ پیٹتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں۔ "ہائے ہائے طفیل تیرا بیڑا غرق، تُو نے مجھ نتروی کی ساری پونجی لٹا دی۔"

کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے بھی تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ طفیل صاحب ہیرا پھیری کے ساتھ چوری سے بھی باز نہ آئے۔ جب یہ چھوٹے سے تھے تو چھوٹے چور تھے۔ بڑے ہوئے تو بڑے چور ثابت ہوئے۔ پہلے ممانی کی اکنیاں، دونیاں اور پیسے چرایا کرتے تھے۔ سیانے ہوئے تو والدہ کی بڑی احتیاط سے چھپائی ہوئی لوہے کی صندوقچی میں سے روپے تک چرانے لگے۔ یہ مشغلہ کوئی مہینہ دو مہینہ چلا ہوگا کہ والدین کو ان کی شرافت کا علم ہو گیا۔ اس سے پہلے اس لیے پتہ نہ چلا کہ یہ چوری میں بھی عقل سے کام لیا کرتے تھے۔ وہ ایک دن میں ایک دو روپوں سے زیادہ نہیں چرایا کرتے تھے۔

چوری میں لاکھ خوبیاں ہوں گی۔ مگر ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن آدمی پکڑا جاتا ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب بھی پکڑے گئے۔ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ محلے والوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ صاحبزادے چور ہیں۔ سگی والدہ

نے چور کو والد صاحب کے حوالے کر دیا اور والد صاحب سیدھے تھانے کی طرف، اب طفیل صاحب رو رو کر منت سماجت کر رہے ہیں۔ ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ مگر والد صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

جب تھانہ قریب آ گیا تو جناب طفیل کے ہاتھ پاؤں اور پھوٹ لے جھٹکا دے کر والد صاحب کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑائی اور سرپٹ بھاگے۔ ان کے والد صاحب زور زور سے پکارتے ہی رہ گئے۔ پکڑو پکڑو چور ہے۔ اب لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ یہ جو چھوٹا سا لڑکا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہا ہے چور بھی ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد انھیں چوری سے ایسی نفرت ہوئی کہ باقی زندگی میں اس آرٹ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ورنہ طفیل صاحب تو اب بھی کہتے ہیں کہ میری ابتدا بڑی شاندار تھی۔

جب یہ سترہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا دولت اور والد کا جنازہ ایک ساتھ اٹھا۔ اب انھیں نہ صرف خود کما کر اپنا پیٹ بھرنا تھا بلکہ ایک چھوٹے سے گھرانے کی دال روٹی کی بھی فکر دامنگیر تھی اتنی سی جان اور زندگی کی یہ سب سے کٹھن راہ۔

چھ سات برس انھوں نے خوشنویسی کے کام پر ضائع کر دیئے۔ مگر اُس میں سے کچھ پس انداز بھی کیا۔ اُس رقم سے ایک دوست کے اشتراک سے پبلشنگ ہاؤس

کی بنیاد رکھی۔ اول تو آج کل کی دوستیاں ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتیں۔ اس پر اشتراک! اس لیے ان کے بھی حسین خوابوں کی تعبیر وہی ہوئی۔ جو عموماً متوقع ہوتی ہے۔

اس واقعہ کا ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بے زاری اور بیکاری میں جب کئی مہینے گذر گئے تو ۱۹۴۴ء میں انھوں نے ادارہ "فروغ اُردو" کی داغ بیل ڈالی۔ ابتداً جو کچھ گزری۔ اس کی داستان کیا پوچھتے ہیں۔ بس یوں جانیے "پریشانیوں اور دشواریوں کا یہ اکیلی جان برسوں ہی مقابلہ کرتی رہی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ تھکے ہارے گھر لوٹے، ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے۔ والدہ نے انھیں یوں پریشان دیکھا تو پوچھا۔ "بیٹا کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں!"

"کوئی بات تو ضرور ہے!"

"بات یہ ہے کہ میں ساری دنیا سے اکیلے ہی لڑ رہا ہوں۔ کوئی بھی تو نہیں ہے جو میرا ساتھ دے۔ نہ رشتہ دار، نہ دوست!"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر تو اکیلا نہیں ہے۔"

"جی ہاں! میرے ساتھ ساری خدائی ہے۔"

"تیرے ساتھ تیرے ولولے ہیں۔ تیری اُمنگیں ہیں۔ تیرے ارادے ہیں ۔۔۔ اور پھر خدا ۔۔۔"

"سب میرے ساتھ ہیں۔ مگر خدا میرے ساتھ نہیں۔"

وایسی بکواس نہیں کیا کرتے۔"

"میں بھی انسان ہوں۔ بچپن سے اب تک ہزار دُکھ جھیلے ہیں۔ مگر اب تک خدا کو ترس نہیں آیا۔"

"دیکھ میں تجھے دو باتوں کی نصیحت کرتی ہوں۔ ایک یہ کہ صبر و ضبط کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ دوسرے کسی بھی کام کو ناممکن نہ جاننا۔"

طفیل صاحب نے ہمیشہ اپنے دوستوں کے رومانس کو سرِ صفحات بدنام کیا ہے۔ دل چاہتا ہے آج ان حضرت کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا جائے۔ کچی عمر میں ایک صاحبہ نے غالباً انھیں بیوقوف سمجھ کر ان سے ذرا ویسی قسم کی خط و کتابت شروع کر دی۔ جب انھیں اُن صاحبہ کی طرف سے پہلا خط ملا تو یہ پاگل خانے کی سیڑھیوں پر ہی سنبھل گئے۔ وہ خط و کتابت نہایت دلچسپ تھی۔ سینکڑوں خطوں کا آنا جانا رہا۔

اگر محترمہ نے اظہارِ بے تکلّفی فرمایا تو انھوں نے مفتیٔ وقت بن کر فوراً ڈانٹ پلائی کہ یہ بات غلط، اگر محترمہ نے کوئی شرارت کی تو انھوں نے چھوٹی عمر میں بڑے میاں بن کر بڑی ہی معنی خیز "ہوں" کر کے اس شرارت کا مزا ہی کرکرا کر دیا۔ اگر انھوں نے کوئی لگاوٹ کی بات کی تو انھوں نے اپنا رشتہ ہی اس سے مختلف بتا دیا۔ غرض جتنی بھی نالائقیاں ان سے سرزد ہو سکتی تھیں، وہ ہوئیں۔ آخری نالائقی یہ کی کہ اس دو طرفہ خط و کتابت ہی کو ایک دن جلا ڈالا۔

جبکہ ان میں سے ایک ایک خط کو خود آں جناب نے ایک ایک دو دو دن کی ریاضت سے لکھا ہوا تھا ـــ آج یہ خود کوشش کر کے بھی لکھنا چاہیں تو اُس جیسا ایک خط نہیں لکھ سکیں گے ۔

ان سارے واقعات پر، یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے (بشرطیکہ انھیں کسی طرح ایک دو برس کی قید ہو جائے ورنہ فرصت کہاں ) جس کی ضخامت کوئی چھ سو صفحات تو ہوگی۔ اُس میں ہیرو کی بُزدلی، نالائقی اور بیوقوفیوں کے ساتھ، دوسرے کی بہن سے اپنے بھائی کا پیار ملے گا۔

زندگی کے اس ابتدائی غلط تجربے ہی کی بنا پر، ان کا خیال یہ ہے کہ عورت ہی کو مرد پر عاشق ہونا چاہیئے ۔ مرد کو عورت پر ہرگز ہرگز عاشق نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر عاشق ہوتا ہے تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے ۔

یہ بخواہ مخواہ کے ناصح مشفق بھی، ایک دن ایک صاحبہ انھیں ادارہ فروغِ اُردو پر اکیلا پا کر ایک نہایت بازاری قسم کا عریاں ناول خریدنے آئیں تو انھوں نے ہوں ہاں ہی نہ کی۔

وہ صاحبہ قدرے تڑخ کر بولیں ـــ "میں پوچھتی ہوں۔ فلاں ناول ہے؟"

"ہے تو مگر آپ کو نہ دوں گا۔"

"کیوں ؟"

"وہ ناول بڑا عریاں ہے۔"

وہ بھنّا کر بولیں۔ "یہ تو مجھے بتائیے۔ آپ میرے سرپرست کب سے بنے ہیں؟"

اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے مگر سوال یہ ہے کہ طفیل صاحب کو دوسروں کی بہنوں کے بارے میں، اپنی بہن کی طرح سوچنے کا کیا حق ہے؟ اگر حق ہے تو جب جواب ملتا ہے تو پسینے کیوں چھوٹتے ہیں۔

ابھی کوئی ایک برس کی بات ہوگی کہ شامتِ اعمال اُس دن بھی یہ اکیلے ہی بیٹھے اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھے کہ ایک صاحبہ وندناتی ہوئی آئیں اور ان سے پوچھا "کنواری ہے؟"

یہ بڑے پریشان ہوئے۔ مگر اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ صرف اتنا ہی کہہ سکے۔ "جی!"

"میں پوچھتی ہوں "دخترِ باکرہ" کا اُردو ترجمہ ہے؟"

"میں فارسی نہیں سمجھتا۔"

"تو کیا اُردو بھی نہیں جانتے؟"

"جی نہیں۔"

طفیل صاحب کے اس جواب پر، پہلے تو مسماۃ نے انھیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر پاؤں سے سر تک اور انھی کے جواب "جی نہیں" کو اس انداز سے لوٹایا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ چغد کہیں کا۔

طفیل صاحب سوائے اپنی ذات کے، ہر بات میں نفاست کا بڑا خیال

لکھتے ہیں اور خوب صورت چیزوں پر جان بھی دیتے ہیں۔ یقین کیجئے انھیں اس حد تک خوبصورتی خو لیا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ یہ ہر چیز میں حسن ڈھونڈھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن یہ لیٹے ایک نہایت ہی بے تکلف دوست سے کہہ رہے تھے " دیکھو نا یار وہ سامنے جو کوّا بیٹھا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے "

خود ان کی اپنی ذات کا یہ حال ہے کہ اگر نیا کوٹ پھٹ گیا ہے تو پھٹ جائے۔ پتلون پر چائے گر گئی ہے تو گر جائے۔ یہ پھٹے ہوئے کوٹ اور چائے گری پتلون کے ساتھ بھی بہ خوشی نباہ کرتے چلے جائیں گے۔ پالش کے معاملے میں ان کے بوٹ عموماً یتیم ہی ملے۔ ٹائی کے بغیر کوٹ اوڑھتے ہیں اور بازار میں اکیلے جاتے ہوئے باتیں بھی کرتے چلتے ہیں۔ جیسے کوئی پاگل!

ان میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر ایک انتظامی خوبی ایسی ہے کہ باقی تمام خوبیاں ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ ان کے خاص خاص دوست جانتے ہیں کہ دعوت کے دن طفیل صاحب کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چنانچہ انھیں حکم مل جاتا ہے کہ اب ہم کھانے پینے کا سامان مہمانوں کے سامنے رکھنے والے ہیں لہذا یا تو آپ یہاں سے چلے جائیں یا ادھر کا رُخ اس وقت کریں جب ہم فارغ ہو جائیں۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ طفیل صاحب کے دوستوں کی کتنی زیادتی ہے ویسے آپ اس کا فیصلہ ان کے انتظام کے تحت جو ایک شادی

ہوئی تھی۔ اُس کا ذکر سُن لینے کے بعد کریں۔

ان کے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے انھیں بلایا کہ میری بہن کی شادی ہے اس میں شرکت کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔ چنانچہ یہ پہنچے ـــ پکوانے وغیرہ کا کام کسی اور کے سپرد تھا۔ ان کے ذمّہ صرف یہ کام تھا کہ برات کو اپنی نگرانی میں کھانا کھلا دینا اور جب دولھا گھر میں داخل ہو تو یہ ہار پہنا دینا۔

باجوں کی آواز قریب آنے لگی تو ان کے ہوش اُڑنے لگے۔ جوں جوں برات قریب آتی گئی، ان کے کان تپنے اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ برات صحن میں داخل ہو گئی۔ اب انھیں دولھا نظر نہیں آتا۔ پہلے کا دیکھا ہوا نہ تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ اس لئے دولھا بن کر بھی آدمی ہی تھا۔ انھوں نے گھبراہٹ میں کسی اور کو دولھا بھائی کا خطاب دے ڈالا۔

اب کھانا نکل رہا ہے اور یہ شور مچا رہے ہیں۔ پلاؤ کی کتنی دیگیں ہیں۔ آٹھ ـــ آٹھ سے کیا بنے گا ـــ یہ حضرت تو پورے شہر کو لے کر آ نکلے ہیں ـــ تو ـ با ـــ دو ـــ ڈال دو پانی ـــ ورنہ مارے جاؤ گے ـــ اسی اثنا میں دو ایک بچے پلاؤ کی پلیٹ لے کر ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلنا چاہ رہے تھے۔ یہ بوکھلائے ہوئے تو تھے ہی۔ انھوں نے رکھ کے جو رنا ٹے دار تھپڑ ایک بچے کو رسید کیا تو وہ کم بخت پلاؤ پھینک، زور زور سے رونے لگا ـــ اب یہ اُسے منا رہے ہیں۔ بھئی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ اور پلاؤ کی پاسنگ چھوڑ دو دو پلیٹیں لے جاؤ

مگر وہ ایسا ضدی بچہ، نہ پلاؤ لیتا تھا۔ نہ چپ ہوتا تھا۔ آناً فاناً انھیں ایک ترکیب سوجھی، جھٹ ایک روپیہ جیب سے نکالا۔ بچے کی ہتھیلی پر رکھا۔ ساتھ ہی ہاتھ جوڑے، تب کہیں بچہ راضی ہوا۔ اس پر بھی اُس بچے نے جاکر اپنی ماں سے کہہ دیا۔ ماں بھی بچے کی طرح بڑی بھلی مانس تھیں۔ ایک دم گالیوں پر اُتر آئیں۔ زنانے میں گالیاں مل رہی تھیں۔ مردانے میں پلاؤ رل رہا تھا۔

اب برات چلی گئی اور گھر کے لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھے تو سب کے سب ان کی باتیں یاد کر کے ہنس رہے تھے اور یہ پریشان ہو رہے تھے کہ جتنی بھی باتیں ان سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ وہ سب کی سب غلط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ، اپنی انتظامی صلاحیتوں کی یوں بے قدری دیکھ کر آئندہ کے لیے توبہ ہی کر چکے ہیں کہ اب کسی کی برات آئے یا جنازہ اُٹھے پروا ہی نہیں کرنی چاہیے۔

اِن کے سر سے والد کا سایہ اُس وقت اُٹھا۔ جب یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے (یکم فروری ۱۹۲۳ء) اور والدہ کا سایہ اُس وقت اُٹھا (۸ جولائی ۱۹۵۸ء) جب یہ اس دنیا میں آبرومندانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق، یہ سب کچھ والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ طفیل صاحب کا اپنی والدہ کے بارے میں خیال یہ ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں، کسی شمار قطار میں ضرور تھیں۔

بیماری سے دو دن پہلے کی باتیں تو یہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے۔

"بیٹا یہ میری آخری بیماری ہے۔"

"یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ بخار ہی تو ہے۔"

"ہے تو بخار، مگر چھوڑو ان باتوں کو، شام کو کتنے بجے لوٹو گے؟"

"کیوں؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ آج تم جلدی سے آجاؤ۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں جاتا ہی نہیں۔"

"نہیں نہیں، بات کوئی نہیں۔ مگر آنا جلدی سے، ایک کام ہے۔"

یہ چلے تو گئے۔ مگر ان کے دل میں کھد بد سی لگی رہی کہ والدہ نے جلدی سے واپس آنے کو کہا ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔ یہ اس دن تین بجے ہی گھر پہنچ گئے۔ دیکھا تو والدہ کی سانس اکھڑی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلا لائے۔ دوائی دی گئی۔ سانس بحال ہو گئی۔ بخار بھی ہلکا ہو گیا۔

دوسرے دن پھر سانس اکھڑ گئی۔ تو پھر یہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے۔ مگر ان کی والدہ نے واپس بلا لیا اور بڑے حوصلے سے کہا: "بیٹا تو جو کچھ چاہتا ہے وہ اب پورا نہ ہوگا۔"

ان کی والدہ ایسی باتیں کرتی ہی رہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ سانس ضرور اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ مگر ظاہری حالت بڑی اچھی تھی۔ تین چار دن میں، بخار سے مریض کی حالت بھلا خراب ہی کتنی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ سانس

پھر بحال ہو گئی۔ بخار بالکل اُتر گیا۔ بظاہر سب کی عید ہو گئی۔

طفیل صاحب نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور والدہ سے کہا۔" بخار بھی اُتر گیا۔ سانس بھی ٹھیک سے آنے لگی ہے۔"

اس پر جواب تو کچھ نہ ملا۔ البتہ مسکرائیں ضرور، جیسے کہہ رہی ہوں پگلا کہیں کا۔

یہ اُس دن کہیں بھی نہ گئے۔ سارا دن ہنسی خوشی باتیں ہوتی رہیں۔ گھر میں رشتہ داروں کا آنا جانا رہا۔ دن گذر گیا۔ رات ہوئی تو گیارہ بجے والدہ نے ان سے سو جانے کے لیے اصرار کیا۔

رات کے ایک بجے کے قریب والدہ نے انھیں بلایا۔ یہ ہڑبڑا کر اُٹھے۔ قریب آئے تو والدہ نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔" بیٹا! میں اِس دُنیا سے جا رہی ہوں۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کا خیال رکھنا۔ دیکھنا وہ دنیا میں کسی طرح بھی آزردہ نہ ہوں۔ یہ کہہ کر چھاتی سے لگا لیا اور یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئے۔ ان پر ان کی والدہ کہنے لگیں۔" روؤ نہیں ابھی مجھے بڑی باتیں کرنی ہیں۔ حوصلے سے کام لو۔"

"حوصلے سے کام کس طرح لوں؟ کیا کروں؟"

یہ تو پھر ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ والدہ نے ایک ایک کو پاس بُلا کر پیار کیا۔ دعائیں دیں۔ چھوٹوں کو بھی، بڑوں کو بھی، جب یہ (بغیر ڈاکٹر کے) واپس

لوٹے تو سب کے سب رو رہے تھے، اور والدہ سب کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں :-

دیکھو، ٹرنک کھول کر، جو سب سے اچھا جوڑا ہو۔ وہ میرے یتیم بھتیجے کی شادی پر دے دینا ــــ میں نے نہ تو کسی کا کچھ دینا ہے اور نہ ہی کچھ لینا ہے ــــ میرے کانوں میں جو سونے کے بُندے ہیں وہ نہلانے والی کو دے دینا ــــ چاروں جمعراتوں پر یتیموں کو بلا کر کھانا کھلا دینا ہے۔"

اب صبح ہونے ہی والی تھی۔ یہ پھر ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے ــــ والدہ کو پتہ چلا تو انھوں نے انھیں پھر واپس بلوایا۔ ڈاکٹر کو لانے سے منع کیا یہ بھی کہا۔ "اب کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس بیٹھو۔ مگر یہ نہ مانے۔ ڈاکٹر کو لانے کے لیے چل ہی دیئے۔

ڈاکٹر کو لے کر جب یہ واپس آئے تو ان کی والدہ ان کی ممانی اور بیگم سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے نہلا دو۔ وہ چپ تھیں کیا کرتیں۔ ایک دن پہلے تک تو بخار تھا وہ نہیں چاہتی تھیں کہ نہلایا جائے ــــ ڈاکٹر دیکھ کر اور دوائی دے کر چلا گیا۔ یہ بھی کہہ گیا۔ خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ بلاوجہ گھبرا رہے ہیں۔

جب بیگم اور ممانی نہلانے پر راضی نہ ہوئیں تو والدہ نے پھر ان کی طرف دیکھا اور اصرار کیا۔ "ان سے کہو۔ مجھے نہلا دیں۔ پتہ نہیں یہ کیا سوچ رہی ہیں مگر میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔"

میں بھی چپ ہو گیا۔ ماموں صاحب بھی چپ ہو گئے۔ بھابی بھی چپ ہو گئیں میرے اشارے پر بیگم نے اُٹھ کر پانی گرم کیا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو والدہ خود چارپائی سے اٹھیں۔ بیگم اور بھابی نے سہارا ضرور دیا۔ مگر وہ غسلخانے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے صابن مل مل کر نہائیں۔ نہانے کے بعد، پیدل چل کر واپس آئیں اور بیگم سے کہا۔ "میرے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کرو۔"

جب یہ سارے کام ہو گئے تو ہلکی سی آواز میں ہوں ہوں کرنے لگیں۔

طفیل صاحب نے پوچھا۔ "اماں کیا بات ہے؟"

"بیٹا تیرا میرا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میں پرایا مال ہوں۔"

اس کے بعد ایک منٹ خاموش رہیں۔ پھر اونچی آواز سے پڑھا۔ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔" اس کے بعد وہ پھر کچھ نہ بولیں۔ حالانکہ سب بلاتے ہی رہے۔

موت اور اس کا اتنا خندہ پیشانی سے استقبال، ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے! والدہ کے انتقال سے طفیل صاحب بجھ کے رہ گئے ہیں۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچتے ہوں کہ دنیا کے یہ سارے بکھیڑے کتنے عارضی اور بے حقیقت ہیں۔

اگر آپ کی ان سے بے تکلفی ہے تو یہ کافی حد تک شگفتہ ثابت ہوں گے تکلف کے تعلقات ہیں تو یہ آپ کو اتنا بور کریں گے کہ آپ پریشان ہو جائیں گے

اور سوچیں گے الٰہی کس بدھو سے واسطہ پڑا ہے جس کے نہ منہ میں زبان ہے۔ نہ دماغ میں بھیجہ، حالانکہ حسب ضرورت ہیں دونوں چیزیں۔ اگر مخاطب بھی کم گو اور بے تکلف نہ ہو تو پھر لطف ہی آجائے گا۔ مجاز لکھنوی اور طفیل لاہوری کے مابین ایک بار بڑے مزے کی باتیں ہوئی تھیں اور یہ گفتگو کوئی پون گھنٹہ کے عرصہ میں ہوئی ہوگی ــــ ابتدا طفیل صاحب کرتے ہیں :

"خیریت" ؟

"جی ہاں !"

"چپ چپ کیوں ہیں ؟"

"یونہی۔"

(کافی دیر سکوت کے بعد) "ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے ؟"

"جی ہاں !"

"آپ بولتے کیوں نہیں۔ کیا بات ہے ؟"

"یونہی"

"اچھا"

"جی ہاں"

(پھر کافی دیر سکوت کے بعد) "لکھنؤ دیکھا ؟"

"کچھ کچھ"

"کافی کیسی ہے؟"

"کڑوی"

"شربت منگواؤں؟"

"بسم اللہ!"

"اچھا یہ بتائیے۔ اس رفتار سے آپ والنّاس تک کب پہنچیں گے؟"

انھیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کرسکتا ہوں جو کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ اسی غلط فہمی نے انھیں مدیر نقوش بنا دیا تھا۔ ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت! ہنھ!!

یہ غلط فہمی انھیں یوں بھی ہوئی کہ تقریبًا تمام شاعروں اور ادیبوں سے ان کے ذاتی اور اچھے مراسم تھے۔ ان میں سے کوئی دوست تھا تو کوئی بھائی، ان کے مدیر ہونے کے فورًا بعد بھائی دوست بن گئے اور دوست دشمن۔ الحمدللہ کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا کوئی دوست ہی نہیں۔ سب اپنے اپنے دلوں میں بھرے بیٹھے ہیں۔

اس میں ان کے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔ اوّل تو انھیں مدیر ہی نہیں بننا چاہیئے تھا۔ اگر بن بیٹھے تھے تو انھیں دوستانہ حقوق کا احترام کرنا چاہیئے تھا۔ مثال کے طور پر، ان کا کوئی دوست میل دو میل سے چل کر آتا ہے اور یہ ہیں نمبر کی دھن میں غرق، دوست پوچھتا ہے "طفیل صاحب خیریت ہے؟"

میار کرشن چندر نے افسانہ نہیں بھیجا۔"

"اوہو!"

جی ہاں!"

"بھابی اور بچے تو اچھے ہیں؟"

"امید ہے کل تک ضرور آ جائے گا۔ مجھے کرشن نے خط لکھا تھا۔ افسانہ لکھ لیا ہے۔ صاف کر کے دو روز تک بھیج دوں گا۔"

"بھائی! میں پوچھ رہا ہوں۔ بھابی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟"

"معاف کرنا بھائی! مجھے ان کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک ہفتہ سے گھر بارہ بجے سے پہلے نہیں جا سکا۔ صبح منہ اندھیرے اُٹھ کے چلا آتا ہوں۔ تاکہ پرچہ جلد آ جائے ہاں بھنک پڑی ضرور ہے کہ جاوید کو بخار آ رہا ہے۔"

"اوہو! کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"پرچہ چھپ جائے تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔" پھر ایک دم کاتب صاحب سے مخاطب ہو کر "بھئی کتابت کتنی ختم ہوئی؟"

وہ دوست جو بیچارا مارے خلوص کے چل کے آیا تھا۔ وہ ان کے پاس آ کر ان کے نقوش خود ہی سے پریشان ہو جاتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ سوچتا ہے شاید یہ اب بھی آدمی کے جامہ میں آ جائیں اور کوئی ڈھنگ سے بات کریں۔ یہ اپنی دُھن میں مست "نمبر ہی کی" "تجہیز و تکفین" کے بارے

میں سوچتے رہتے ہیں۔ بالآخر خلوص کی زد میں آیا ہوا دوست اِن کی یہ حالت دیکھ کر، جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تب یہ چونکتے ہیں اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ، اُس کا بازو پکڑ کر کہتے ہیں "یار چائے تو پی لو"

"میں اتنی دُور سے آپ کے پاس صرف چائے پینے آیا تھا؟"

تب انھیں اپنی نالائقی، مردم بیزاری اور دوست کُشی کا احساس ہوتا ہے، دوست سے معافی مانگتے ہیں۔ اسے باہر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ مگر وہ جو دوست کے خلوص کو ٹھیس لگتی ہے۔ اُس کا ان کے پاس کوئی مداوا نہیں ہوتا۔ دوستوں کو ناراض کیا۔ بھائی مروتاً دوستی تک بھی آ گئے۔ غرض اتنے انہماک کے بعد جو نمبر مرتب کیے۔ ان کے بارے میں لکھنؤ سے ایک خط آتا ہے:۔

"آپ نے شخصیات نمبر میں ہر ایرے غیرے کو شامل کیا ہے۔
مگر مجھ پر مضمون نہ چھاپا۔ اب آپ سے کون دوستی رکھے۔"

ایک اور خط بمبئی سے آتا ہے:

"آپ بھی عجیب چیز ثابت ہوئے ہیں۔ افسانہ نمبر میں، جو آپ نے میرا افسانہ لیا ہے۔ وہ میرا سب سے گھٹیا افسانہ تھا۔ آخر آپ نے یہ مجھ سے کس وقت کا انتقام لیا ہے۔"

کراچی سے ایک شاعر نے زبانی پیغام بھیجا:۔

"آپ نے غزل نمبر میں فیض کی نو چھ غزلیں چھاپی ہیں اور

میری صرف ایک، کیا میں محض ایسے گھٹیا شاعر ہوں ۔ اگر آپ کو
شاعری کے الف بے کا پتہ نہیں تو کسی سے پوچھ لیا ہوتا۔"

لاہور والے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ وہ شخصیات نمبر میں بھی نہیں
آئے تھے ۔ افسانہ بھی اُن کا گھٹیا شامل ہو گیا تھا۔ غزل نمبر میں بھی کسی کی ایک
غزل آئی تھی اور کسی کی نہیں آئی تھی ۔ چنانچہ منچلوں نے چائے کی میز پر بیٹھ کر یہ
پروگرام بنایا کہ ہم سب نقوش کے دفتر چلتے ہیں۔ ایک نے کہا۔ میں طفیل کا
گریبان پکڑوں گا ۔ دوسرے نے کہا ۔ میں گھونسہ ماروں گا۔ تیسرے نے کہا۔
میں مصلحتاً بیچ بچاؤ کراؤں گا۔ مگر تم اپنا کام کرتے جانا۔

خیر یہاں تک تو غنیمت تھا۔ کوئی انھیں گالی دے لے تو دے لے۔
کوئی تھپڑ مار کر خوش ہو لے تو ہو لے۔ مگر ایک دن ایسا ہوا کہ لاہور سے کراچی
جاتے ہوئے اخبار نویسوں نے یہ پروگرام بنایا کہ واپسی پر مدیر نقوش کی خبر
لی جائے۔ بنیاد سجاد ظہیر کے افسانے کو بنایا۔ جسے طفیل صاحب نے پہلے ہی
کانٹ چھانٹ کر کے اصل سے کافی بے ضرر بنا دیا تھا۔ (اُس صورت میں بھی اُس
میں قابلِ اعتراض باتیں نہ تھیں ) میرا عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اُس سے مُدیر
نقوش کی نیت کا تو اندازہ ہو ہی سکتا تھا۔ جبکہ اسی قسم کا ایک نوٹ افسانے
کی ابتدا میں بھی موجود تھا۔

قباحت یہ بھی کہ طفیل صاحب کے نزدیک اُس افسانے کی شمولیت

یوں ضروری تھی کہ وہ افسانہ نمبر کی صورت میں، ایک طرح کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ اُس دور کے اِس انداز کے افسانے بھی آئیں۔ جب مذہب سے بیزاری، خدا اور رسولؐ کا تمسخر (نعوذ باللہ) اور انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔۔۔ اور اسی غلط روش کو دکھانے کے لیے طفیل صاحب نے اِس افسانے کی شمولیت ضروری سمجھی تھی۔

چنانچہ ایک دم طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ مخالفت میں بھی، موافقت میں بھی، مخالفت زیادہ تھی۔ موافقت کم، حالانکہ بعض لوگ کہتے ہی رہے کہ طفیل کی نیّت کی طرف بھی دیکھو۔ اُس کا ہرگز یہ مقصد نہیں جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ مگر صاحب کون سنتا تھا۔ بڑا عمدہ پلان بنایا گیا تھا۔ مسجدوں میں مدیرِ نقوش کو مطعون کیا گیا۔ موچی دروازے کے باہر جلسہ ہوا۔ پکٹنگ کے پروگرام بنے۔ کسی نے سوچا دفتر کو آگ لگا دی جائے کسی نے سوچا جان سے مار دیا جائے۔۔۔ اور یہ سارا ہنگامہ اُس جانِ ناتواں کے بارے میں تھا۔ جس نے کبھی سر اُٹھا کے نہیں دیکھا کہ "یہ کنکری کس طرف سے آئی ہے۔"

مدیرِ نقوش کو جب اپنی موت سامنے نظر آئی تو انھوں نے خدا سے التجا کی ـــــ تُو تو علیمٌ بذاتِ الصّدور ہے۔ میرے بھی سینے کے بھیدوں کو جانتا ہے اور میرے مخالفوں کے بھی ـــــ اِدھر دوستوں نے سمجھایا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ تُو اخباروں میں لوگوں سے معافی مانگ لے

اور اس افسانے ہی کو حذف کر دے ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس دنیا میں ان کی گستاخی کا یوں فیصلہ ہوا۔ اب انھیں آخرت کے فیصلے کا انتظار ہے ۔ ممکن ہے وہ اس سے مختلف ہو۔

انھوں نے اپنے بارے میں جب بھی غور کیا تو ـــــ ایک طفیل کے اندر دوسرا طفیل بھی چھپا ہوا پایا۔ ایک طفیل تو وہ ہے جس نے بزرگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے ۔ جو پڑھے لکھوں کے سامنے طالب علمانہ حیثیت میں بیٹھا ہے ۔ جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل مبتدی جانا ہے۔

دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے ۔ جب یہ کرسیٔ ادارت پہ ہوتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے ۔ اس وقت انھیں بڑے سے بڑے علاّمہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اسی خرابی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔

آپ خود ہی سوچیں جس کی افسانہ نگاری میں دھوم ہو۔ نقاد اسے صفِ اوّل کا افسانہ نگار مانیں ۔ اس کے افسانے کو اگر مدیر نقوش ناقابلِ اشاعت قرار دے دے تو کیا وہ ان سے خوش ہوگا۔ وہ تو یہی کہے گا نا کہ جاہل ہے یہ۔

جس شاعر کی نظم یا غزل دس ہزار کے مجمع میں پڑھی گئی ہو اور اسے سامعین نے دل کھول کر داد بھی دی ہو۔ وہ بھی اگر مدیر نقوش کی نظریں نہ سہنچے تو پھر شاعر بے چارا ان کی شاعرانہ سوجھ بوجھ پر فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔

جس نقاد نے تمام مغربی نقادوں کو پڑھا ہو (اور اتفاق سے اپنے ہاں کے تنقیدی سرمایہ سے استفادہ نہ کیا ہو) اور ان کے حوالے پہ حوالے دے کر مضمون کو جاذبی بھر کم بنا دیا ہو۔ وہ مضمون بھی اگر نقوش میں نہ چھپے تو پھر آپ ہی بتائیں مدیرِ نقوش کی عقل کا ماتم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی ہے :-

ایک نقّاد نے (اب ان کا نام کیا لوں) انھیں ایک مضمون بھیجا۔ اچھے خاصے بڑے نام والے نقاد تھے۔ جب وہ مضمون پڑھا تو انھیں نہ جچا۔ جناب نقاد کو بڑے احترام کے ساتھ لکھ دیا کہ یہ مضمون نقوش میں نہ چھپ سکے گا اور اس میں فلاں فلاں نقائص ہیں۔

وہ صاحب بڑے برہم ہوئے۔ پہلے تو وہ نقوش اور مدیرِ نقوش کی تعریفیں کرتے تھکا نہ کرتے تھے۔ پھر ایک دم معصوم قسم کی گالیوں پر اُتر آئے۔ مثلاً نالائق اور بدتمیز قسم کے الفاظ بے دریغ استعمال کر ڈالے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو۔ بعد میں وہ مضمون "نگار" جیسے بڑے پرچے میں چھپ گیا۔ تب وہ صاحب اور چڑھے۔ ایک اور خط لکھا۔ جس میں مژدہ سنایا گیا تھا کہ وہ مضمون نیاز فتحپوری جیسے علاّمہ نے تو پسند فرمایا ہے۔ مگر جناب جیسے "پڑھے لکھے" نے واپس کر دیا تھا ـــــ یہ واقعہ اپنی جگہ ضرور صحیح ہے۔ مگر طفیل صاحب کا آج بھی دیانتداری کے ساتھ یہ خیال ہے کہ نیاز صاحب لاکھ علاّمہ سہی۔ میرے

ذہنی گزر سہی، نگار اُردو کا عظیم الشان پرچہ سہی۔ مگر وہ مضمون نقوش میں چھپنے کے قابل نہ تھا۔

انھیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا عشق ہے کہ کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہوگا۔ بلا مبالغہ انھوں نے اپنے ایک ایک نمبر پر اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر بن آئی ہے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، جن دنوں کوئی خاص نمبر زیر ترتیب ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ نہ وقت پر کھانا کھانا۔ نہ سونا، دن رات کام، صبح کے جُھٹ پُھٹے اگر رات کے ایک دو بھی بج گئے۔ تو بھی انھیں کچھ پروا نہیں۔ بلکہ مگن ہیں۔ مست ہیں۔

ایک بار یہ ہوا کہ یہ اپنے دفتر سے رات کے بارہ بجے لوٹے۔ بیگم سے کہا۔ کھانا لاؤ۔ وہ بیچاری آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔ کھانا گرم کر کے لائی۔ دیکھا تو یہ پھر نقوش کے عشق میں غرق، کاپیاں پڑھ رہے ہیں۔

بیگم نے، شوہر کو اپنے سہاگ کا واسطہ دے کر کہا۔ "خدا کے لیے کام بند کر دیجیے۔ بہت ہو چکی۔ اب کھانا کھائیے۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں"۔

یہ اُسے منت سماجت سے کہتے ہیں۔ "خدا کے لیے چُپ رہو۔ لوگوں کو نہ جگاؤ۔ میرے منہ میں نوالے ڈالتی جاؤ۔ تاکہ کھانا بھی ہو جائے اور کام بھی، یوں کھانا کھایا۔ رات کے تین بجے سوئے۔ مگر بیگم کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی صبح سات بجے جگا دینا۔

بیگم کے لیے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ آس نے سات بجے جگا دیا۔ اب ان سے اٹھا نہیں جاتا۔ آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ایک دن کی جگائی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ یہاں تو روز کا قصہ تھا۔ بیگم برہمی اور طنز سے کہتی ہیں۔ "اب اُٹھتے کیوں نہیں۔ رسالہ لیٹ ہوا جا رہا ہے۔"

یہ کہتے۔ "اٹھنا تو چاہتا ہوں مگر آنکھیں نہیں کھلتیں۔"

پھر طفیل صاحب پچکار کے بیگم سے کہتے ہیں۔ "میرے قریب آؤ۔ میرے پپوٹوں کو زور سے اُوپر کو اٹھاؤ۔ تاکہ میری آنکھیں کھلیں اور میں اُٹھ سکوں۔"

ممکن ہے کوئی صاحب اسے زیبِ داستان ہی سمجھیں۔ مگر ہے یہ واقعہ اب یوں کبھی کبھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اب تو ان کی زندگی یونہی گزر رہی ہے۔ یونہی گزر جائے گی۔ زندگی کی لطافتیں اور مسرتیں انھیں بہ آوازِ بلند پکارتی رہتی ہیں۔ مگر یہ اُن سب سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ جیسے بالکل مردہ ہوں۔

قیافہ شناسی میں بھی یہ بڑے ماہر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں صورت دیکھ کر ہر کسی کے کیریکٹر کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ ایک بار یہ اور اُن کے ایک اخبار نویس دوست تانگے پر سوار فلم دیکھنے جا رہے تھے۔ معاً ایک تانگہ پاس سے گزرا۔ اُس میں نقاب اُلٹے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ چاند سی صورت اُس پر بھی میک اپ۔ ان کے اخبار نویس دوست نے، اُسے دیکھتے ہی انھیں ٹھوکا دیا۔ یہ بھی متوجہ ہوئے اور فتویٰ دے دیا۔ "یہ لڑکی آوارہ ہے۔"

"ارے نہیں۔"

"شرط لگا لو۔"

"جو کہو۔"

اب ان کے لیئے، یہ ثابت کرنا کہ یہ آوارہ لڑکی ہے بڑا دشوار تھا۔ آج کل آوارہ لڑکیاں کہاں آوارہ دکھتی ہیں۔ اِدھر ان کے دوست کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ لڑکی قطعاً آوارہ نہیں ہے۔ اب یہ کرتے تو کیا کرتے۔

انھوں نے تانگے والے سے کہا۔ "میاں کوچوان! ذرا اپنے گھوڑے کو دوڑاؤ اور اُس تانگے کے برابر چلو۔"

کوچوان نے انکی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر زبان سے یہ کہا۔ "بہت اچھا سرکار۔"

اب ان کا تانگہ، اس تانگے کے برابر برابر چل رہا ہے۔ لڑکی نے بھی اس بات کو تاڑ لیا۔ انھوں نے اس سے پہلے، کبھی کسی لڑکی کو آوارہ ثابت نہیں کیا تھا۔ اس لیئے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیئے انھوں نے لڑکی کی طرف تین چار منٹ ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔

لڑکی نے بھی پہلو بدلا۔ اور اپنی ران سے ہاتھ اُٹھا کر بڑے مہذب انداز میں سلام کیا۔ اب تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دوست کے چٹکی لی اور اسے نظروں ہی نظروں میں سمجھایا۔ دیکھا، کچھ ہم نہ کہتے تھے۔

تانگہ میکلوڈ روڈ پر پہنچ گیا۔ جہاں کا تانگے والے سے طے کرکے آئے تھے۔ تانگے والے نے انکی طرف دیکھا۔ انھوں نے اسے کہا۔ فکر نہ کرو۔ تانگہ اُدھر لیے چلو۔ جدھر وہ تانگہ جا رہا ہے منہ مانگے دام ملیں گے۔

"بہت اچھا سرکار، پر یہ کام بڑا ٹیڑھا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی تھانے

کی ہوا کھاؤں۔"

"بھئی جو خدا کو منظور ہو۔"

"خدا کو کیا منظور ہوگا۔ اس قصّے کو چھوڑیئے۔ وہ تو ہے ہی بدمعاش، دیکھا ابھی سلام کر رہی تھی۔"

کوچوان کے ان ریمارکس پر انھوں نے اپنے دوست کی طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے انھوں نے ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لی ہو۔

یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ان کا تانگہ اس تانگے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ یہ دل میں سوچتے بھی تھے کہ ہٹاؤ اس قصّے کو، آخر کیا فائدہ، مگر زبان نے دل کا ساتھ نہ دیا۔ تانگے برابر چلتے رہے۔ وہ لڑکی بھی ٹکٹکی لگائے دیکھتی ہی رہی یہ بھی، کبھی وہ اپنے پریشان بالوں کو سنبھالتی، کبھی یہ مسکرا دیتے، کبھی وہ مسکرا دیتی تو یہ سہم جاتے۔ غرض انھی بوالعجبیوں میں، اُس کا تانگہ ایک جگہ رُک گیا اور ان کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔

کوچوان نے پوچھا "روکوں باؤجی تانگے کو؟"

"نہیں"

"پھر"

"سگریٹ دو ذرا۔"

گھوڑا سرپٹ دوڑتا رہا۔ مگر یہ اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا یا یہ۔

کھیلوں میں بھی یہ کئی بازیوں سے حد درجہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اتنی دلچسپی کہ اللہ دے اور بندہ لے ـــــ کیرم بورڈ اور تاش میں اتنے گم نہیں جتنے پتنگ بازی اور کرکٹ میں۔

کوئی پندرہ سال بعد پچھلے برس انھیں پتنگ بازی کا پھر سے اُبال آیا۔ گھر میں اعلان کر دیا۔ اب کے بسنت پر پتنگیں بڑھیں گی ـــــ بچے بڑے سب حیران، بڑی ہانک دی ہے۔ اب اس عمر میں بچوں والا مشغلہ کیا اختیار کریں گے۔ مگر بسنت سے ایک دن پہلے چھ چھ "گوتوں نے دو پنے" منگوائے گئے۔ درجنوں چھوٹی بڑی پتنگیں ساتھ آئیں۔ رات بھر کنّے باندھتے رہے۔ جس وقت مؤذن نے اذان دی۔ انھوں نے منڈیر پر چڑھ کے دیکھا، تو اُس وقت کوئی بھی جیالا پتنگ بڑھائے ہوئے نہ تھا۔ خاصہ اندھیرا تھا۔ پتنگ بڑھے تو کیسے بڑھے۔ البتہ کہیں کہیں چھتوں پہ ایک ایک دو دو منچلے کھڑے محسوس تو ہوئے۔ مگر نظر نہ آسکے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے "وہ کاٹا" کا زوردار نعرہ لگایا اور اپنی پتنگ بڑھا دی۔ اوروں کے بھی حوصلے بڑھے۔ انھوں نے بھی جواباً وہ کاٹا کا نعرہ لگایا۔ پھر کیا تھا آناً فاناً حریف پیدا کر لیے۔

قسمت کے دھنی یہ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ہوا بھی خوب تیز تھی۔ انھوں

---

؎ لفظ پتنگ مذکر ہے۔ مگر "لاہور اسکول" والے اسے مؤنث ہی لکھنا پسند کریں گے۔

نے جس سے پیچ لڑایا کاٹا۔ جب حریفوں نے دیکھا کہ یہ تو صفایا کر رہے ہیں۔ تو تین تین چار چار اکٹھے حملہ آور ہوئے۔ اس میں بھی زیادہ تر میدان انہی کے ہاتھ رہا۔ آس پاس کے محلوں میں دھاک بیٹھ گئی۔ بفضلِ خدا اب اپنے علاقہ میں دوسرے سال سے پتنگ بازی میں چیمپئن چلے آ رہے ہیں۔

انھیں لمبے پیچ لڑانے میں مزا آتا ہے۔ "کھینچ کھانچ" کو یہ قطعاً پسند نہیں کرتے کہتے ہیں دشمن کو اپنے جوہر دکھانے کے پورے موقعے دینا چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے اتنے لمبے پیچ جانے تھے کہ پتنگ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ لڈو کے برابر نظر بھی آئی تو کیا۔

ایک لمبے پیچ میں، ان کے ہاتھ ڈور کی مسلسل رگڑ سے لہولہان ہو گئے بھی کہتے رہے کہ پتنگ ہمیں دے دیجئے۔ ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے، مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ برابر اُف اُف سی سی کرتے ڈھور دیتے رہے۔ کوئی آدھ پون گھنٹے کی جدوجہد کے بعد جب انھوں نے پیچ کاٹا، تب انھوں نے پتنگ اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کی۔ بڑھی ہوئی پتنگ کو جب اُتارا جا رہا تھا تو ڈور ان کے خون سے نہائی ہوئی تھی۔

کرکٹ کا بھی شوق، انھیں بُرا لگا ہے۔ لاہور سے باہر میچ ہو رہے ہوں تو یہ اپنے دفتر ہی میں ریڈیو لے جائیں گے۔ جب تک میچ ہوتا رہے گا، برابر کومنٹری سنتے رہیں گے۔ ہزاروں کام ہوں، کچھ نہیں کریں گے۔ کوئی ملنے والا بھی آئے تو

بات ہی نہیں کریں گے۔ باتیں ہوں گی بھی تو کرکٹ ہی کے بارے میں۔

سبھی قابلِ ذکر میچ انھوں نے یا تو دیکھے ہوں گے یا سنے ہوں گے۔ ابھی پاکستان میں آسٹریلیا کے میچ ہوئے ہیں۔ یہ ریڈیو سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ ہٹے کوئی اچھی ہٹ لگائے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ کوئی اچھا گیند پھینکے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ سیٹیاں بھی بجاتے تھے۔ ناچنے سے انھیں ان کی پوزیشن روکتی تھی۔ ورنہ یہ بیقرار اس کے لیے بھی تھے۔

یوں بھی ہوا ہے کہ کومنٹری سنتے سنتے ایک دم بے حد خوش ہو گئے۔ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگ گئے۔ پوری قوت سے تالیاں پیٹنے لگے۔ پھر نوکر کو آواز دی۔ جلدی سے پانچ روپے کے لڈو لا ــــ وجہ پوچھی گئی۔ تو بتایا ہارڈے آؤٹ ہو گیا ہے۔

ان کی صحت یوں تو کبھی زیادہ اچھی نہیں رہی۔ چھوٹے چھوٹے بیسیوں عارضے لاحق رہے۔ مگر یہ باضابطہ قسم کے بیمار بہت کم ہوئے۔ مگر صاحب ایک بار ہوئے، خوب ہوئے۔ مزا آگیا۔ یہ قصہ ۱۹۴۸ء کا ہے کہ بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گئے۔ سو کے اُٹھے۔ طبیعت مضمحل پائی۔ چہل قدمی کو نکلے۔ گھر تک واپس پہنچنا مشکل ہو گیا۔ لیٹے تو پھر لیٹ ہی گئے۔

بہتیرے دوا دارو اور ٹونے ٹوٹکے ہوئے۔ مگر طبیعت نہ سنبھلی۔ بگڑتی ہی گئی۔ معاملہ دواؤں سے دعاؤں تک پہنچا۔ مگر دونوں ہی علاج بیکار ثابت

ہوسئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی جواب دے دیا۔ جب یہ خوشخبری عام ہوئی کہ جناب طفیل اب ایک دو دن کے مہمان ہیں تو ان کے قریبی دوست آخری دیدار کو آن پہنچے۔

"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں اب آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔"

"بخار ہلکا ہو گیا ہے۔"

"انشاءاللہ کل تک ٹھیک ہو جائیں گے۔"

طفیل صاحب یہ ساری باتیں سنتے رہے۔ بولنے تک کی ہمت نہ تھی۔ نقاہت اتنی تھی کہ اگر منہ پر مکھی بیٹھ جاتی تھی تو ہاتھ اٹھا کر اُسے ہٹانے تک کی ہمت نہ تھی۔ بس ہڈیوں کا ایک پنجر تھا۔ جو چارپائی پہ بار تھا۔ یہ اپنے دوستوں کو ان کی باتوں کا جواب دینا چاہتے تھے۔ مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ اپنی اس حد تک معذوری پہ ان کے آنسو نکل آئے۔ دوستوں نے آنسو پونچھے تو انھوں نے سنائی نہ دینے والی آواز میں دوستوں کی باتوں کا جو جواب دیا یہ تھا:۔

"ڈاکٹروں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے۔ جو آپ حضرات کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر میں ضرور صحت یاب ہوں گا۔ آج نہیں تو کل، میرا بھی فیصلہ ڈاکٹروں کو سُنا دینا۔"

غیر معمولی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر، یہ موت کے منہ سے بھی

نکل آتے ہیں۔ قوتِ ارادی کے استحکام ہی سے انھیں زندگی میں آرزومند بنا لیا ہے
ان کے پاس اگر کوئی دولت ہے تو یہی۔ اگر انھیں ایسی کسی بات پر ناز ہے ہے
تو اسی پر

جب موت ان کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ تو یہ خدا سے من ہی من میں
جو باتیں کرتے تھے۔ وہ کچھ اس قسم کی تھیں:۔

"اے اللہ میں تجھ سے درگذر کی التجا کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ
مجھے زندگی عزیز ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میری امنگوں اور آرزوؤں کا خون ہوا جا رہا
ہے۔ میں اس دنیا میں آکر کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔
میری موت آج نہیں تو کل واقع ہو جائے گی۔ مگر تو مجھے اُن ولولوں اور ارادوں
کی تکمیل کے لیے زندہ رکھ۔ جنھوں نے میرے ذہن سے نکل کر ابھی تک
زندگی کی ایک ساعت بھی نہیں گزاری۔"

کئی دنوں کی بات ہے کہ یو۔پی کے ایک صاحب، ان کے پاس آئے
انھوں نے انھیں بھی یو۔پی کا سمجھ لیا اور لگے پنجابیوں کی برائیاں کرنے۔ پنجابی یہ
ہوتے ہیں۔ پنجابی وہ ہوتے ہیں۔ میری ترقیوں میں رکاوٹ پیدا کردی۔ مجھے
تنگ کرتے ہیں۔ مجھے ستاتے ہیں۔ یہ چپکے سنتے ہیں۔ جب انھوں نے کہا پنجابی
بڑے حرامزادے ہوتے ہیں تو انھوں نے اپنے نوکر سے کہا "صاحب کے لیے
چائے لاؤ۔"

چائے کا سُن کر یو-پی والے صاحب سمجھے ہوں گے۔ یہ بھی پنجابیوں کے ہاتھوں ستا ہوا ہے۔ وہ اور چڑھے۔ پھر تو وہ ماں بہن کی گالیوں تک آ گئے۔ مسٹر طفیل صاحب نے دوسرے نوکر سے کہا "صاحب کے لیے مٹھائی کا بھی انتظام کرو۔"

چائے آئی، مٹھائی آئی۔ دونوں نے خوب کھائی اور پی۔ ہنستے بھی رہے پیار سے باتیں بھی کرتے رہے۔ جب وہ صاحب جانے لگے تو انھوں نے ان سے پوچھا۔ "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"یہ پوچھ کر کیا کیجئے گا؟"

"نہیں بتائیے۔"

"جانے دیجیے۔"

"میں پنجابی ہوں۔"

یہ شکل وصورت کے اعتبار سے بس لونڈے سے ہیں۔ مدیر نقوش ہونے کا مطلب تو یہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد جیسا جبّہ پہنا کرتے، سر سید ایسی داڑھی ہوتی --- ابوالکلام جیسا رعب و دبدبہ ہوتا۔ برعکس اس کے یہ سیدھے سادے آدمی کا بچہ ہیں۔ نہ رعب نہ کچھ۔ ان کی شکل وصورت سے زیادہ ان کے نام کا اثر ہے۔ ایک لطیفہ آپ بھی سُن لیں :-

ان کے چھوٹے موٹے کام تعارفی رقعوں سے ہو جایا کرتے ہیں۔ جو کام ہوا جس سے ہوا۔ تعارف ہو یا نہ ہو۔ لکھ کر کہہ دیا۔ ہو گیا۔ لوگ عزّت کرتے ہیں

لحاظ کرتے ہیں۔

ایک دفعہ یہ اپنے ایک کام کے لیے، خود دفتر میں جا نکلے۔ چق اُٹھا کر صاحب سے ملے اور بغیر تعارف کے ملے۔ وہ نہایت رُکھائی سے پیش آئے۔ یہ اپنا تعارف بھی نہیں کرا پائے تھے کہ وہ صاحب برسے۔ "کیا بات ہے؟"

"جی! مجھے آپ سے ایک کام ہے؟"

"کیا کام ہے؟"

"جی وہ ذرا ـــــ"

"آپ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے، میرے ہیڈ کلرک سے ملتے۔ سپرنٹنڈنٹ سے ملتے۔ میرے اسسٹنٹ سے ملتے۔ سیدھا منہ اٹھاتے ہیں اور میرے پاس چلے آتے ہیں ـــ چپڑاسی! ان صاحب کو کس نے اندر آنے دیا؟"

"جی غلطی ہو گئی"

"خبردار جو آئندہ کوئی یوں اندر آیا۔"

"بہتر جناب!"

ڈرامے کا یہ سین ان کے سامنے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ سٹ پٹا گئے۔ گردن لٹکائے اپنے دفتر پہنچے ٹیلیفون اٹھا کر انہی صاحب سے بات کی۔

"میں نقوش کے دفتر سے طفیل بول رہا ہوں۔"

"کیسے حضور مزاج تو اچھے ہیں؟"

"جی ہاں اللہ کا شکر ہے"

"فرمایئے آج کیسے بھول گئے۔ مدت کے بعد یاد فرمایا۔ کوئی میرے لائق خدمت؟"

"یہ ایک ذرا سا کام ہے"

"آپ اپنے چپڑاسی کو چٹ دے کر بھیج دیں۔ ابھی ہو جانے گا"

"بہت اچھا چپڑاسی کو بھیج رہا ہوں"

"دیکھئے کبھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نکلنی چاہیے"

"جی!"

"میں کہتا ہوں۔ کبھی دفتر آیئے نا!"

"آ آ ــــ آج ــــ اچھا ــــ !!"

ان کی زندگی کے ایک دو خوش کن واقعات یہ ہیں۔ جن پر مجھے آج بھی خوشی ہوتی ہے۔

ابھی یہ اپنے کاروبار کی ابتدائی اسٹیج پر تھے۔ چند ٹکے بھی ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھے۔ اُن دنوں انہوں نے ایک دکان سے آرٹ پیپر کا ایک ریم خریدا۔ ایک مزدور کے سر پر اٹھوایا۔ دو آنے مزدوری مقرر ہوئی۔ بارش کی وجہ سے بازار کیچڑ سے لت پت تھا۔ آرٹ پیپر بڑا پھسلواں ہوتا ہے یہی وجہ

تھی کہ یہ مزدور سے بار بار کہتے تھے۔ دیکھو بھئی احتیاط سے چلو۔ کاغذ کو مضبوطی سے پکڑو۔ گر گیا تو پچاس روپے کا ریم تباہ ہو جائے گا۔ یہ فقرہ انھوں نے ایک بار نہیں۔ تین چار بار دہرایا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وہ ریم سر سے پھسل کر زمین پر گر ہی گیا اور کیچڑ میں نہا گیا۔ مزدور کانپنے لگا۔ یہ چپ رہے۔ مزدور نے کاغذ سمیٹا ساتھ چل دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے کاغذ ایک کونے میں رکھ دیا اور خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔

انھوں نے جیب سے چار اکنیاں نکالیں اور مزدور کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

مزدور شرمندہ ہو کر بولا۔ آپ سے دو آنے طے ہوئے تھے۔"

"دو آنے اُس صورت میں تھے۔ جب تم کاغذ کو صحیح سالم لے آتے۔"

"جی!"

"اب تم چونّی رکھو۔"

ابھی پانچ چھ ماہ کی بات ہے کہ یہ سائیکل پر سوار صبح سویرے ہی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے تھے کہ اسمبلی ہال کے پاس انھیں ایک اپاہج لڑکا ملا۔ جو چلنے سے بالکل ہی معذور تھا۔ اُس نے التجا کے انداز میں ان سے کہا۔ "مجھے سائیکل پر بٹھا کر گنگا رام اسپتال تک لے جائیں۔" انھیں جلدی تھی۔ گزر گئے۔ مگر لڑکے کی خواہش ان کا برابر تعاقب کرتی رہی۔ یہ قبرستان کے قریب پہنچ گئے ہوں گے۔ مگر لڑکے کی بات ذہن سے نہیں اُتری تھی۔ ذہن سے اُترنی

تو کجا، پریشانی بڑھنے لگی۔ چنانچہ یہ اُلٹے پاؤں پلٹے۔ لڑکے کو سائیکل پر بٹھایا۔ خود پیدل چل کر اسے ہسپتال تک پہنچایا۔ لڑکا کہتا رہا۔ سائیکل پر سوار ہو جائیں، آپ کو جلدی ہوگی۔ یہ جواب دیتے۔ نہیں پیدل چلنے میں لطف آ رہا ہے۔

جب لڑکا منزلِ مقصود پہ پہنچ گیا تو انھوں نے اس سے معافی مانگی۔ "میں جلدی میں تھا۔ اِس لیے اپنے فرض سے غافل ہو گیا تھا۔"

ایسی ہی "بیوقوفی" کی ایک بات اور بھی سُن لیں۔ ایک دن یہ صبح سویرے ہی اپنے دفتر میں اس لیے آ کر بیٹھے کہ ایک ضروری کام کو نپٹا لیا جائے۔ خوب گرمیوں کے دن تھے۔ پنکھا کھولا۔ کاغذ، قلم، دوات لے کر بیٹھے۔ خوب موڈ میں تھے۔ اتنے میں ٹھک سے پنکھے کے ساتھ کوئی چیز لگی۔ یہ اُٹھے، اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ایک چڑیا پنکھے سے ٹکرا کر گر پڑی ہے۔ فوراً لپکے۔ چڑیا کو اٹھایا۔ جو آدھ موئی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اسے اپنے ہاتھوں کی گرم آغوش میں لیا اور پانی پانی کا وہ شور مچایا، جیسے پانی کے بغیر یہ خود ہی مرے جا رہے ہوں۔ چڑیا نے پانی پیا تو وہ "پھُر" کرنے لگی۔ مگر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ وہ جان سے تو نہ گئی، مگر داغی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اسے اونچی جگہ پر بٹھا دیا۔ مگر خود سارا دن کوئی کام نہ کر سکے۔ وہ ضروری کام بھی ہاتھ پھیلا کر رہ گیا۔

یہ عموماً بڑی بڑی باتوں کو پی جاتے ہیں۔ بعض اوقات یونہی اکڑتے بھی جاتے ہیں۔ یہ صبح یا اس وقت ہوتے ہیں۔ جب ان کی نیت پر حملہ کیا جائے۔ ورنہ بڑی سے

بڑی بات ہوئی اور گئی۔

پطرس نمبر کے سلسلے میں انھوں نے کئی ایک لکھنے والوں کو خط لکھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ پنسلین کے انجکشن لگانے والے ڈاکٹر نہیں ادب کے ڈاکٹر، بڑا رعب اور طنطنہ ہے ان کا۔ سبھی ان کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو جی میں آئے۔ کہتے رہتے ہیں۔ کوئی بولتا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے طفیل صاحب کے جواب میں لکھا:۔

طفیل صاحب قبلہ:

"یہ آپ نے مرے ہوئے آدمیوں کو بیچنے کا کیا ڈھنگ نکالا ہے؟ نہ بھائی یہ بات اچھی نہیں۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ لوگ (یعنی اردو کے رسالوں والے) اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مرے اور اس کا نمبر نکالیں۔ خواہ جیتے جی اس کی طرف مڑ کے بھی کسی نے نہ دیکھا ہو۔ بخاری میرا دوست تھا اور میں اس کے لیے بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ابھی اس موڈ میں نہیں ہوں اور کم از کم مردہ نمبر کے لیے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ مردہ نمبروں نے مجھے اس قدر حساساں کیا ہے کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہوا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو میرا مردہ نمبر شائع نہ کرنے دیا جائے کیونکہ مجھے اب یہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ کوئی صاحب خود

---

سہ، اساں

ضرور میرے "نامِ زندہ کو" مُردہ فروشی کے بہانے بیچ کر پیسے بنائے گا
اور مجھے یہ ضد ہے کہ اُردو کی خدمت کرنے والے یہ کام نہ کریں۔"

جس وقت انھیں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط ملا تو انھوں نے اپنے اُوپر ہزار لعنتیں بھیجیں کہ اور نکال شخصی نوعیت کے نمبر بہ اہلِ قلم سے اپنی عقیدت کے اظہار میں نمبر نکالتے ہیں۔ لوگ اسے منافع خوری کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے زخمی چیتے کی طرح ان پر جوابی حملہ کیا:۔

برادرم، سلام مسنون!

آپ کے خط میں اگر صرف یہی لکھا ہوتا کہ میں مضمون نہیں لکھ سکتا
تو شاید میں چپ ہو جاتا۔ مگر اب تو جواب عرض کرنا ضروری ہو گیا
پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مرنے پر کوئی بھی رسالہ
نمبر نہیں نکالے گا۔ بلکہ شاید لوگ یہ کہیں، چلو اچھا ہوا کہ مرا۔ البتہ ہمارے
گھر والے ہمیں روئیں گے۔ اس لیے کہ ہماری ذات سے ان کا مفاد وابستہ
ہوگا — میری یہ بات شاید اب دل لگی کا درجہ رکھے مگر مجھے اس کے
سچ ہونے پر سو فی صد یقین ہے۔ کسی کے لیے آپ روئے ہیں۔ کسی
کے لیے میں! میدان البتہ الگ الگ ہیں۔

"مردہ نمبر کی ترکیب مجھے پسند آئی۔ غالباً آپ یہ چاہتے ہیں
کہ حفیظ جالندھری کی طرح زندگی ہی میں ہم اہم شخصیت نمبروں میں نکال

کیا جائے۔ اگر کسی کا جلوس اس کی زندگی میں نہ نکلے تو پھر بعد میں بھی نہ نکلے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اگر کوئی ادیب اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو باقیوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اُسے خراجِ عقیدت پیش کریں۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی کہ مرحوم کے بارے میں رسائل نمبر نکالیں۔

دیکھئے نقوش اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بڑی شخصیتوں کی آڑ لے کر اُبھرے۔ بلکہ اللہ کے فضل سے اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ وہ اگر پطرس نمبر نہیں نکالے گا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے منٹو نمبر نکالا تھا اور یہ سمجھ کے نکالا تھا کہ منٹو ایک بڑا تیکھا آرٹسٹ تھا۔ اسے خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہیے۔ مگر اس پر بعض نستعلیق قسم کے لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ نقوش کا یہ مقام نہ تھا ــــ پھر اس کا دوسرا پہلو بھی دیکھئے۔ منٹو نمبر کا پہلا ایڈیشن آج بھی بازار میں ملتا ہے مگر میرے دوسرے نمبروں کے تین تین چار چار ایڈیشن چھپے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میری یہ کوششیں صرف مالی منفعت کے باعث نہیں۔ بلکہ ایک ادیب سے عقیدت کا اظہار ہیں۔

معاف کیجئے گا۔ میں نے اکثر یہ اندازہ لگایا کہ آپ اچھی باتوں

کے بڑے پہلوؤں پر ہی سوچتے رہتے ہیں یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور
خرابی بھی ـــــ پلڑا کونسا بھاری ہے؟ اس کا اب فیصلہ کون کرے؟
امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ آپ نے "پیاری باتیں" لکھیں
میں نے پیاری باتیں سنائیں ــــ والسلام"

اب چونکہ یہ سلسلہ نقوش منافع خوری کی بات چل نکلی ہے۔ تو طفیل صاحب کا ایک خط اور بھی پڑھ لیں۔ جو انھوں نے اپنے ایک دوسرے دوست (اختر انصاری) کو لکھا تھا:۔

برادرم، سلام مسنون!

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ آپ کی تمام تر تخلیقات کا
انتخاب اب تک چھپ جانا چاہیئے تھا۔ یہ شکایت نہ صرف
سو فی صد حق بجانب ہے بلکہ حساب کی رُو سے اگر دو سو فیصد بھی
درست ہوسکتی تو بھی ٹھیک تھا۔ تو بھی غلط نہ ہوتا۔
مگر یار کیا بتاؤں۔ یہ جو نقوش کی بیماری میری جان کو لگی ہے
اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میرا لاکھوں کا ادارہ چوپٹ ہو گیا ہے
یہ کہ ٹی نئی کتاب چھپی ہے یہ کسی پرانی کتاب کا نیا ایڈیشن آتا ہے۔
پریس بھی میری بلے تو بھی کا بڑی طرح شکار ہے۔ خود بڑا پریشان ہوں
کئی بار اپنے اوپر غصہ آتا ہے (ادارہ اور پریس کی حالت دیکھ کر)

جی چاہتا ہے یا تو خودکشی کر لوں۔ یا نقوش کو بند کر دوں تاکہ میں باقاعدہ قسم کا آدمی بن جاؤں اور وہ سب کچھ کروں۔ جو میرے لیے دنیاوی اعتبار سے زیادہ سود مند ہو ــــ یہ خیال کرتا ہوں تو نقوش محبوبیت کی تمام تر تڑپا دینے والی اداؤں کے ساتھ میرے عزائم پر برق بن کر گر جاتا ہے اور میں پھر ایک زخم خوردہ عاشق کی طرح اس پر واری نثاری ہو جاتا ہوں۔ بہک جاتا ہوں۔ مارا جاتا ہوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے نقوش میں مالی اعتبار سے نقصان ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے نقوش کے حسن و جمال میں مزید تابانی پیدا کرنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ باقی کے سارے کام ٹھپ ہو گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو بہ حیثیت مجموعی یہ سودا مہنگا پڑ رہا ہے میرے عشق نے جو میری حالت بنا رکھی ہے وہ سب کچھ آپ سے کہہ دی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ کی کتاب کی جلد تر اشاعت سے مجبور رہا۔ والسلام!

ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ طفیل صاحب بڑے نفاست پسند ہیں اس کا اقرار اور لوگوں نے بھی کیا ہے۔ مگر میں آپ کو ان کی نفاست پسندی اور کاہلی کا حال ایک ساتھ ہی سنا دوں۔

مثلاً ان کے قلم کی نب خراب ہو۔ سیاہی اچھی نہ ہو۔ یہ کسی کو خط ہی

نہیں لکھیں گے۔ خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ پھر جس دن یہ سب چیزیں اچھی ہوں گی۔ یہ خط پہ خط لکھتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ بلا وجہ بھی خط لکھتے رہیں گے۔ جس دن انھیں خط لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو یہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ خط لکھ ڈالیں گے

ان کی میز مسودات، ضروری اور غیر ضروری کاغذات سے پٹی رہتی ہے ان کے اردگرد بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اگر ایک بڑے سے لفافے میں ضروری خط اور مسودے پڑے ہیں تو دوسرے لفافے میں بھی، غرض بیسیوں لفافوں میں، اگر کسی چیز کی انھیں ضرورت پڑ جائے تو ضروری نہیں وہ اسی دن مل جائے۔

کبھی کبھی ان کا چپڑاسی، میز کی یہ حالت دیکھ کر، سارے لفافوں کو ایک جگہ باندھ کر، کسی دوسری جگہ رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ وہ برداشت نہیں کرتا کہ میز کو مال گودام بنتا دیکھے۔ مگر یہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ ہر کاغذ کو قیمتی سمجھ کر اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ہر کاغذ کو غیر ضروری سمجھ کر ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی قیمتی مسودے بھی وقتی طور پر گم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ انھیں ہفتوں اور مہینوں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ پسند نہیں کہ کوئی کام آسانی سے ہو جائے یہ ہر آسان کام میں خود دشواریاں پیدا کر کے پھر سے اُسے آسان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ایک دن ایک صاحب انھیں اپنی غزل دے گئے۔ انھوں نے رکھ لی۔ دوسرے تیسرے دن وہ صاحب تشریف لائے اور پوچھا۔ "میری

غزل چھپے گی ؟ "

" نہیں "

" اچھا پھر مجھے واپس کر دیجئے "

" پتہ نہیں اب کہاں ہے ؟ "

" یہیں میز پر ہو گی ۔ ڈھونڈھ دیجئے ! "

" ملے گی نہیں ملے گی "

" مل جائے گی "

" جناب میری میز پر اگر ہاتھی بھی گم ہو جائے تو وہ بھی ایک دن میں تو مل نہیں سکتا "

طفیل صاحب تصوّر کے بے حد قائل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں ۔ یہ ہر کام کے لیے ان تھک کوشش کرتے ہیں ۔ کام ہو جاتا ہے تو شکر گزار ہو جاتے ہیں ۔ نہ ہو جب بھی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہو گیا ۔

کسی دوست نے انھیں ورغلایا کہ حکومتِ وقت کو اپنے کارناموں سے مطلع کرو ۔ وہ تمھارے کام کے بدلے اور کچھ نہیں تو ایک آدھ توصیفی جملہ تو بھیج ہی دے گی ۔ یہ بڑے خوش ، سارے نمبروں کا ایک بڑا سا پلندا بنا کر بھیج دیا اور اب اس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جس دن حکومت اعلان کرتی ہے کہ فلاں کو یہ تمغا دیا ، فلاں کو یہ خطاب ــــ چنانچہ صاحب وہ تاریخ بھی آئی ۔ جس دن یہ کام

ہوتا ہے۔ اب یہ بار بار ناموں کو پڑھتے ہیں۔ مگر اُن میں اِن کا نام نظر نہ آیا۔ بڑے آزردہ ہوئے۔ مگر مایوس نہیں۔ فوراً تصور کی دنیا میں چلے آئے اور یہ سمجھ لیا کہ مجھے حکومت نے، سب سے بڑا ادبی اعزاز دے دیا ہے۔ اب کوئی لاکھ کہے کہ میاں، تمھیں تو کسی نے منہ لگایا ہی نہیں۔ مگر یہ کسی کی کب سنتے ہیں۔ اپنی موج میں رہتے ہیں۔ اپنے تصوّرات کی دُنیا میں بستے ہیں، جو ان کی کلفتوں اور آزردگیوں کا واحد سہارا ہے۔

یہ کبھی کبھی یوں بھی سوچتے ہیں :-

" بہ فرضِ محال میں آج مر جاؤں تو کیا ہو۔ بہت سے لوگ تو خوش ہوں گے۔ کچھ خدا ترس قسم کے لوگ، (میری تمام تر نالائقیوں کے باوجود) شاید یہ کہیں کہ اچھا ہی آدمی تھا۔ جن کو ادب سے شغف ہوگا۔ وہ ممکن ہے یہ کہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اچھے اچھے نمبر نکالے ——— اور بس ——— غور کیجئے میرے بعد میری زندگی کا حاصل یہی ایک فقرہ ہوگا ——— صرف اسی ایک فقرے کے لیے میں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے ؟ دنیا تیاگ دی ہے۔ مجھے زندگی کی دلکشیوں اور مسرتوں سے واسطہ نہیں رہا۔ دن رات کام کرتا ہوں۔ دن رات مرتا ہوں ——— دن رات مرتا ہوں۔ دن رات کام کرتا ہوں۔

یار دوستوں سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بیوی سے ہنسنا بولنا میرے مقدر میں نہیں۔ گھر سے

دفتر، دفتر سے گھر — صرف ایک فقرے کے لیے۔

اگر میں عین جوانی میں مر گیا۔ جس کے بڑے امکانات ہیں تو میرے بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا اور میرے بچے اس فقرے کو چاٹا کریں گے "ہمارے ابّا نے بڑے بڑے اچھے نمبر نکالے تھے"

بہر حال ان کے بعد، جو کچھ بھی ہو۔ انھوں نے اپنی زندگی صرف اسی ایک فقرے کے لیے ضائع کر دی ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

# (۳)

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں، وہ حرف بہ حرف سچ ہوتا ہے، شخصی تحریروں میں یادوں کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔ یادیں دھندلی ہوتے ہوتے معدوم بھی ہو جاتی ہیں۔

جب یہ مضمون چھپا تھا تو مجھ سے کچھ دوستوں نے کہا تھا کہ ان میں فلاں فلاں بات غلط ہے ـــــ غلط باتیں میرے ذہن میں کیسے راہ پا گئیں۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہوگا۔

اب میری گزارش یہ ہے کہ اس مضمون میں مندرج ساری ہی باتوں کو صرف افسانوی یادداشتیں سمجھا جائے ـــــ ایسی یادداشتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس حصہ میں چند شخصیتوں پر سرسری سے جائزے ہیں۔

(محمد طفیل)

# قاضی عبد الغفارؒ

سخت بیمار تھے۔ چل چلاؤ والی بات تھی۔ اس پر اخلاق ملاحظہ فرمایئے کہ کارڈ بھیجنے پر بلوا لیا۔ نحیف و نزار، تکیوں کے سہارے پڑے تھے۔ بات تک کرنے میں انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔ مگر جب کمرے میں پہنچا ہوں تو قدرے اٹھ کر ہاتھ ملانے کی کوشش کی اور رُک رُک کر باتیں کرتے رہے۔ باتوں کا زیادہ تر موضوع یہ رہا کہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے بے بس ہوں۔ صحت کا جو حال تھا وہ تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بس سانس چل رہی تھی، مگر ہمت ملاحظہ ہو کہ اس حالت میں بھی کچھ فائلیں اور کچھ کاغذات ارد گرد رکھے ہوئے تھے۔ بالکل وہی نقشہ ہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بھلا سوچیے تو موت سامنے ناچ رہی ہے اور یہ اس سے آنکھیں چرا کر کچھ نہ کچھ کیے جا رہے ہیں۔

کہتے تھے کہ میں بستر پر مرنا نہیں چاہتا۔ چاہتا ہوں کہ زندگی کی ریل

گاڑی میں جُتا ہُوا مروں ـــــ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی ـــــ جس دن ان کے انتقال کی خبر پہنچی اسی دن مجھے ان کا ایک خط بھی ملا۔

باتوں باتوں میں اس پر بے حد افسوس کرتے رہے کہ اکثر ادیب اور شاعر فکرِ معاش سے مجبور ہو کر فلم کمپنیوں میں جا رہے ہیں اور اپنے جوہروں کو فلم کمپنیوں کی چار دیواریوں میں دفن کر رہے ہیں ـــــ جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کو اکٹھا کر لیں اور اپنے سے کبھی جدا نہ ہونے دیں ـــــ نہ ان کا بس چلا نہ ان کا ارمان پورا ہوا۔

میں نے پوچھا ـــ "قاضی صاحب! آج کل کوئی کتاب بھی زیرِ تصنیف ہے؟"

"جی ہاں! طویل بیماری کی وجہ سے میں نے لیٹے لیٹے ہی اپنے ذہن میں تو کئی کتابیں لکھ لی ہیں۔ اگر میرے ہاتھ نے ذہن کا ساتھ دیا تو جلد ہی تین چار کتابیں مکمل ہو جائیں گی۔"

"مجھے آپ کی کتاب "آثار جمال الدین" بڑی عزیز ہے۔"

"مجھے بھی اپنی وہی کتاب پسند ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں میں نے یورپ کا سفر کیا اور ڈاکٹر براؤن نے میری بڑی مدد کی ـــــ اتفاق دیکھئے کہ جب میں لندن پہنچا تو ڈاکٹر براؤن سخت بیمار تھے ـــــ میں نے خط لکھ کر

اپنا مقصد عرض کیا اور ساتھ ہی ملاقات کی اجازت چاہی، بلوالیا ـــــ ان کی بیگم نے استقبال کیا اور ساتھ ہی مجھے ہدایت کی کہ آدھ گھنٹے سے زیادہ نہ بیٹھئے گا۔

باتیں شروع ہوئیں تو میں معلومات کے ہجوم میں گھر کے رہ گیا۔ اٹھنا بھی چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے روکا۔ گھنٹوں باتیں ہوئیں ـــــ واپس آنے لگا تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک دوسرے کمرے میں میرے کام کی جتنی بھی کتابیں ہو سکتی تھیں وہ سب میز پر پھیلا رکھی تھیں ـــــ خوب استفادہ کیا۔ بہت سے دوستوں کے نام ڈاکٹر صاحب نے خط بھی لکھ دیئے۔ ان سب سے ملا اور ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے سب نے میری بڑی مدد کی۔ بڑی عزت کی۔

اس کے بعد میں مصر پہنچا۔ ڈاکٹر رشید رضا سے ملنے، کیونکہ مفتی محمد عبدہٗ کی بدولت ان سے جمال الدین افغانی پر بڑا مواد مل سکتا تھا۔ انھیں تین چار خط لکھے اور اپنے ہندوستان سے آنے کی غرض بتائی۔ جواب تک نہ دیا۔ خود ملنے گیا تو ملاقات سے انکار کر دیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور ایک خط لکھ کر واپس ہندوستان آ گیا۔

میرے ہم سفر حکیم اجمل خاں بھی تھے۔ میں تو پہلے مصر پہنچ گیا تھا وہ بعد میں آئے۔ ان کے رشید رضا سے دوستانہ مراسم تھے۔ جب حکیم صاحب رشید رضا سے ملے تو انھوں نے میری شکایت کی کہ ہندوستان سے عبدالغفار آئے تھے۔ میں ان سے نہیں ملا تو بڑا سخت خط لکھ کر چلے گئے۔

قاضی صاحب نے اس سارے واقعہ پر یوں بھی تبصرہ کیا ــــ "جن کا جمال الدین تھا انھوں نے میری کوئی مدد نہ کی۔ جن کا جانی دشمن تھا انھوں نے میری رہنمائی کی۔"

اس پر میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا: "آپ کو اس کتاب کی خاطر بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔"

"جی ہاں۔ مجھے اس ایک واقعہ پر کہ جمال الدین افغانی کو زہر دے دیا گیا یا وہ طبعی موت مرے تھے، کئی مہینے ریسرچ کرنی پڑی۔ جب تک جمال الدین افغانی کے معالج ڈاکٹر سے خود پوچھ گچھ کر کے تسلی نہ کر لی، میں نے قلم کو روکے رکھا۔"

قاضی صاحب کو میں نے بے حد متواضع، حلیق، سادہ اور دُھن کا پکّا پایا ــــ الرابدن، قدرے لمبا قد، چھوٹی سی داڑھی، چہرے پر جھرّیاں ــــ اور باتوں میں شعر ڈھلتے دیکھے۔

# یگانہ چنگیزی

اکھڑتی سانسوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

ایک کمرے میں بند، چند ٹوٹی پھوٹی اور بے ترتیب سی چیزوں کی موجودگی میں میرزا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اتنے باکمال شاعر کو یوں خستہ حال دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔

ان کو اس حالت تک پہنچانے میں زیادہ تر ان کی اپنی ہی کوششوں کو دخل رہا ہے۔ وہ اس وقت بھی غالب کے بُری طرح رقیب بنے بیٹھے تھے اور غالب کی شاعری کو ذہنی آوارگی کا درجہ دیتے تھے۔ اقبال کو سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔

میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ مدت سے اپنے حالات کے قطعی ناموافق ہونے کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو ہی چکے تھے۔ جبھی وہ کبھی تو خدا پر برستے تھے، کبھی غالب کو آوارہ شاعر کہتے تھے اور کبھی اقبال کی عظمت کے منکر بنتے تھے۔

ان کمزوریوں کے باوجود، اردو غزل میں اپنے اسٹائل کے تنہا مالک!

بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگے اور پھر مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے میرا جلوس

دیکھا تھا؟"

"کیسا جلوس؟"

"اجی وہی جس میں مجھے جوتوں کے ہار پہنائے گئے تھے۔ میرا منہ بھی کالا کیا گیا تھا اور گدھے پر سوار کر کے مجھے شہر بھر میں گھمایا گیا تھا۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ میں نے وہ جلوس نہیں دیکھا۔"

"واہ صاحب واہ! آپ نے تو ایسے اللہ کا شکر ادا کیا ہے جیسے کوئی گھٹیا بات ہو گئی ہو۔ سوچو تو سہی کہ آخر کروڑوں آدمیوں میں سے صرف مجھی کو اپنی شاعری کی وجہ سے اس اعزاز کا مستحق کیوں سمجھا گیا؟ — جب کہ یہ درجہ غالب تک کو نصیب نہ ہوا۔ میر تک کو نصیب نہ ہوا —"

میں چاہتا تھا کہ میرزا صاحب اس تکلیف دہ قصّہ کو یہیں ختم کر دیں مگر وہ مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے جیسے انھوں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو اور اس کے بدلے یہ گراں قدر انعام پایا ہو۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فوراً وہ غزل کے موڈ میں آ گئے۔ "جی ہاں جناب! آپ کے لاہور میں بھی گرفتار ہوئے تھے۔"

"وہ قصّہ کیا تھا؟"

"جناب قصّہ یہ تھا کہ میرزا یگانہ چنگیزی یہاں سے کراچی کا پاسپورٹ لے کر چلے تھے۔ ورلاہور پہنچ کر اپنے ایک دوست کے ساتھ پنجاب سے نکل کر

سرحد پہنچ گئے تھے واپسی پر گرفتار کر لیا گیا۔ (ایک دم جمع سے واحد کے صیغے پر آ گئے) اکیس روز جیل میں بند رہا۔ ہتھکڑی لگا کر عدالت میں لایا گیا۔ پہلی پیشی پر مجسٹریٹ صاحب نے نام پوچھا۔ میں نے بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بڑی شان سے بتایا۔ "یگانہ!"

ساتھ کھڑے ہوئے ایک وکیل صاحب نے بڑی حیرت سے مجھ سے سوال کیا۔ "یگانہ چنگیزی؟"

جی ہاں جناب!"

یہ سنتے ہی مجسٹریٹ صاحب نے (غالباً آفتاب احمد نام بتایا تھا) میری رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔

جب رہا ہو گیا تو جاتا کدھر؟ اور پریشان ہو گیا ـــــ مجسٹریٹ صاحب نے میری پریشانی کو پڑھ لیا۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ میرے تمام روپے تھانے والوں نے جمع کر لیے تھے ـــــ اب مجھے دلوا دیجئے ـــــ اس پر مجسٹریٹ صاحب نے کہا درخواست لکھ دیجئے ـــــ میرے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی کاغذ کہاں سے لاتا اور کیسے درخواست لکھتا۔ اس پر بہ کمال شفقت مجسٹریٹ صاحب نے مجھے ایک آنہ دیا اور میں نے کاغذ خرید کر درخواست لکھی جس پر مجھے فوراً روپے مل گئے۔ آپ لاہور جائیں تو آفتاب احمد صاحب کے پاس جا کر میرا سلام ضرور عرض کریں ـــــ اور ہاں آپ بھی لاہور جا کر اب یہ کہیں گے کہ یگانہ سے ملے تھے۔ آپ یگانہ سے کہاں ملے ہیں؟ یگانہ کو گوشت پوست

کے ڈھلنچے میں دیکھنا غلط ہے۔ یگانہ کو اس کے شعروں میں دیکھنا ہوگا ــــ یگانہ کو اس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر دیکھنے کی بجائے اس مسند پر دیکھنا ہوگا۔ جس پر وہ آج سے پچاس برس بعد بٹھایا جائے گا۔"

میں نے میرزا صاحب کو خودسر ــــ مفروضہ آن کے مالک ــــ صرف خود کو خدائے سخن ماننے والے ــــ زمانہ کی ناقدری کے سخت شاکی (جن میں شمع معمے کے حل پر انعام نہ ملنا بھی شامل ہے) اپنے غلط نظریات پر اٹل ایمان رکھنے والے ــــ خود کو بااصول تصور کرنے والے پایا۔

ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یہ علم تھا کہ میں ایک ایسے صاحبِ فن کی خدمت میں حاضر ہوں جس پہ مجھے فخر ہونا چاہیے۔ کاش زمانہ ان کا ساتھ دیتا۔ اور وہ اپنے ذہن کی غلط روش سے بچ نکلتے۔

اکہرا بدن، چپٹی ناک، کالا رنگ، کلین شیو، بھونڈی شکل والے کا ایک خوبصورت شعر یہ بھی ہے ؎

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

# اسرار الحق مجاز

آل احمد سرور نے کافی ہاؤس چلنے کے لیے کہا، پہنچے، تو سامنے کی میز پر ایک صاحب کو پہچاننے کی بڑی ناکام سی کوشش کی —— سرور صاحب نے پوچھا۔ "مجاز سے تعارف ہے ؟"

"جی ہاں ! کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔"

سرور صاحب کے اس سوال پر میں نے ذہن کو کئی جھٹکے دئے۔ تب جا کر پہچانا کہ سامنے کی میز پر مجاز ہی تو ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ خود اُٹھ کر ہماری میز پہ آئے، اور آتے ہی پوچھا۔ "کب آئے ہیں آپ ؟"

یہ وہ مجاز تھے جن کے بارے میں مشہور رہا ہے کہ بہت پیتے تھے۔ ڈوب ڈوب کر پیتے تھے —— وہ مجھ سے زیادہ باہوش تھے۔ نہ صرف پہچانا بلکہ اخلاق میں بھی (ہماری میز پر آکر) سبقت لے گئے۔

پہلے سے زیادہ دُبلے —— پہلے سے زیادہ خستہ حال —— پہلے سے زیادہ سنجیدہ —— پہلے سے زیادہ چُپ چاپ !

میں نے خیریت پوچھی تو اللہ کے شکر کا اقرار کیا۔ شعر و شاعری کی بات کی تو اپنے بانجھ ہونے کا یقین دلایا۔ وجہ پوچھی تو چپ ہو گئے —— جیسے کہہ رہے ہوں کہ جناب تو بڑے بے وقوف ہیں۔

اس حالت میں بھی کوئی نہ کوئی بات کر گزرتے تھے جس سے ان کی ذہانت پر ایمان لا کر مسکرانا پڑتا تھا۔ یہ ملاقات بڑی مختصر رہی۔ دوسرے دن کے لیے پھر کافی ہاؤس ہی میں ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے اور یہ بھی کہہ گئے کل خوب باتیں ہوں گی۔

حسبِ وعدہ وہ دوسرے دن موجود تھے۔ میں انھیں دیکھتے ہی ڈرا کہ لیجئے آج تو خوب باتیں ہوں گی۔ ڈرا اس وجہ سے کہ میں اوّل درجہ کا بات چور ہوں۔

یہ اکیلے ہی ایک میز پر براجمان تھے۔ کافی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے میرے حصّے کی بھی کافی منگوا رکھی تھی۔ خود پی رہے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔

ہماری ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو ملاحظہ ہو جس کی ابتدا میں نے کی۔

"خیریت[1] ؟"

"جی ہاں !"

"چپ چپ کیوں ہیں ؟"

"یونہی"

---

[1] مندرجہ ذیل چند سطریں جو مجھ پر مضمون ہے۔ اس میں بھی آ گئی ہیں۔ تکرار کی معذرت مگر ان کی ضرورت دونوں جگہ تھی۔

اب مجاز صاحب ــ "ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے؟

"جی ہاں"

"آپ بولتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

"یونہی!"

"اچھا!"

"جی ہاں!"

لکھنؤ دیکھا؟"

"کچھ کچھ!"

"کافی کیسی ہے؟"

"کڑوی!"

"شربت منگواؤں؟"

"بسم اللہ!"

"اچھا یہ بتائیے اس رفتار سے آپ والتاس تک کب پہنچیں گے؟"

یہ تھے وہ تمام مکالمے جو کوئی سوا گھنٹہ کی نشست میں ہوئے۔ کبھی میں بات کرکے ڈوب جاتا تھا۔ کبھی وہ 'آخرِ ان' کے ایک دوست نے آکر ہم دونوں کو بے بسی سے نجات دلائی کوئی پندرہ منٹ اور نشست رہی ہوگی کہ مجاز صاحب نے پھر دوسرے دن گھر پر آنے کی دعوت دی مگر میں نہ جاسکا۔

ج وہ جس طرح ہیں ہیں، وہاں خود کسی کو بلاتے ہوئے ہچکچاتے ہوں گے۔

لمبے قد، گلبین شیو، سانولے رنگ، لمبے بال، قدرے خوبصورت خط و خال۔ ویسے مجاز ہی کا تو یہ شعر ہے ؎

اس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

# ڈاکٹر محمد باقر

کسی لڑکے کی سفارش مقصود تھی یا اسی قسم کا کوئی [illegible]ب مگر بیہودہ سا کام لے کر ہم ڈاکٹر باقر کے ہاں ماڈل ٹاؤن پہنچے۔ میرے ہمراہ میرے دیرینہ دوست ملک محمد اسلم تھے۔ ان کی ڈاکٹر صاحب سے پہلے کی خوب سلام دعا تھی۔ اپنی اس سے پہلے ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔

پکارنے پر ڈاکٹر صاحب برآمد ہوئے۔ دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ جیسے انھیں پہلوانی چھوڑے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ جسم پر ململ کا کرتہ اوڑھے تہبند باندھے سلیپر پہنے، ہنستے ہوئے السلام علیکم ملک صاحب کہہ کر ہاتھ بڑھایا۔ محبت سے ملے۔ چھوٹتے ہی احساس ہوا کہ یہ صاحب پروفیسر تو ہیں مگر سڑی نہیں ہیں۔

جب تک ہم بیٹھے، بڑے پیار سے، ہمیں اپنا برخوردار سمجھ کر باتیں کرتے اور باتیں بناتے رہے۔ جو رائے بھی دی، جو بات بھی کہی قطعی معقول، سوائے اس بات کے کہ میرے فلاں گورنر سے تعلقات ہیں۔ فلاں وزیر میرا پانی بھرتا ہے۔

اخباروں کے تراشے رکھنے' ہر قسم کی ادبی دستاویزوں کو محفوظ کر لینے کا انھیں بڑا ہوکا ہے۔ آپ ان سے آج بھی بیس پچیس برس پہلے کے تمام ملکی اور ادبی موضوعات پر ہر قسم کا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا جانے' لوگ کہتے ہیں کہ جس سے ان کی ٹھن جاتی ہے' اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور بڑے تکرّم باز ہیں۔ اپنا رشتہ ان سے نیازمندوں والا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی حدود میں رہنا پسند کروں گا۔ ورنہ باقر صاحب سے ملاقات ہو گی تو منہ چھپانا پڑے گا۔

مجھ سے جب بھی ملتے ہیں بڑی محبت سے ملتے ہیں اور پہلا فقرہ بغیر سلام دعا کے' ان کا یہ ہوتا ہے "سُنا بھئی طفیل کیا حال ہے تیرا" اس کے بعد ادبی باتوں سے لے کر' سیاسی باتوں تک ۔۔۔ سیاسی باتوں سے لے کر نہاں خانوں کی باتوں تک پوری بے تکلفی کے ساتھ کھڑے ہی کھڑے تبصرہ کر ڈالیں گے۔

پچھلے دنوں یہ ایران گئے تھے۔ میں نے پوچھا کیسی گذری؟ ۔۔۔۔

خوب گذری یار ۔۔۔ ڈاکٹر مصدق سے ملا' شاہ ایران سے ملا' ان کے بھائی سے ملا۔ فلاں سے ملا ۔۔۔ فلاں سے ملا ۔۔۔ وہ ساری یادداشتیں اور فوٹو لایا ہوں۔ دکھاؤں گا آپ کو۔"

آپ کا وہ مضمون' جو آپ نے وہاں کے عظیم الشان غسلخانوں کے بارے میں لکھا ہے۔ مجھے بڑا ہی پسند ہے۔"

ہے نا۔ — وہ مضمون بہت پسند کیا گیا ہے۔ مگر میں نے اصلی واقعات تو لکھے ہی نہیں اس لیے کہ وہاں ایسے غسلخانے بھی ہیں جن میں لوگ مادر زاد ننگے نہاتے ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں —— وہاں نہلانے والوں کا بھی انتظام ہے۔ جس کا جی چاہے ان کی مدد سے نہلالے۔ خوب رگڑ رگڑ کر نہلاتے ہیں اور جسم پر سے اتنی میل اتار دیتے ہیں کہ بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ ابھی کالے صاحب سے گورے صاحب بن جائیں گے۔"

"آپ تو ایسے بیان کر رہے ہیں جیسے خود بھی ننگے نہائے ہوں۔"

"چل ہٹ، بے شرم کہیں کا۔"

ڈاکٹر صاحب بڑے سخت پنجابی ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں انھیں سب سے ترقی یافتہ اور بڑی زبان پنجابی ہی نظر آتی ہے۔ پنجاب کی اور اہلِ پنجاب کی ایک ایک ادا پر واری نثاری ہیں۔ دوسروں کی سنتے بھی ہیں۔ اپنی سناتے بھی ہیں۔ مگر سناتے زیادہ ہیں سنتے کم ہیں۔ ہر ایک کا کام بخوشی کر دیتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ نوّے فی صد اچھے آدمی ہیں۔ دس فی صد جو کمزوریاں ہیں وہ بھی اگر خدانخواستہ نہ ہوتیں تو یہ سب بےچارے اشرف المخلوقات میں سے خارج ہو جاتے۔

# حمید احمد خاں

میرے نزدیک ان کا شمار بھی بزرگوں میں ہے۔

سید وقار عظیم جب باقاعدہ لاہور آ گئے تو میں نے انھیں نقوش کی ادارت کے سلسلے میں پھانسنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ معلوم ہوا وقار صاحب حمید احمد خاں کے پاس بیگم روڈ پر ٹھہرے ہیں۔ بیگم روڈ پہنچا۔ وقار صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور حمید احمد خاں صاحب سے بھی۔

درمیانہ قدو قامت کے آدمی، پنجابی ہوتے ہوئے بھی بڑے نستعلیق۔ کبھی اتنے سنجیدہ ہو جاتے جیسے یقین ہو جائے کہ ابھی فرما دیں گے "نکل جاؤ میرے گھر سے" کبھی ایسے باغ و بہار جیسے پہلا یقین واہمہ بن جائے۔

میری ان سے نہ زیادہ واقفیت تھی اور نہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے باب میں زیادہ باتیں نہیں بتا سکتا۔ اس کے باوجود یہ بات طے ہے، جس نے انھیں قریب سے دیکھا ہے وہ ان کی بڑی تعریف کرتا ہے۔

جب یہ لندن گئے تو مجھے اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں نے لاہور کے پتے پر نقوش کا ایک شمارہ بھیجا تو ان کا لندن سے جواب، ایک دستی رقعہ کی شکل

میں ملا۔" آپ کا پرچہ میرے گھر والوں کو موصول ہوا تھا مگر میں تو یہاں ہوں اس لیے پرچہ واپس بھیج رہا ہوں۔

مجھے ان کی اتنی احتیاط اچھی معلوم نہ ہوئی۔ کچھ دکھ سا ہوا۔ جب سے لندن سے آئے ہیں ان سے باقاعدہ ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ملاقات کی آرزو تو ہے مگر جلد پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ میں نے ایک دن انھیں اپنے دفتر کے سامنے سے آنکھیں بچا کے گزرتے دیکھا ہے۔ ارادے کے باوجود اب ملاقات کا حوصلہ ہو تو کیسے؟

لندن سے آنے کے بعد میں نے ان کے ایک مضمون کی بڑی دھوم سنی۔ موضوع تھا: اقبال کی چوریاں۔ علامہ اقبال نے مغربی ادیبوں اور شاعروں کے خیالات سے استفادہ کر کے جو نظمیں بغیر حوالے کے نظم کی ہوئی تھیں ان پر تھا مضمون۔ خوب چرچے ہوئے اس مضمون کے۔ اخباروں میں مخالف اور موافق لکھا گیا۔ کسی نے حمید احمد خاں کی اس جرأت کی داد دی۔ کسی نے سنا ڈالیں۔ بہرحال رہا معرکہ۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ نتائج سے بچا کر چلنے کے باوجود ان میں زندگی کی تمام حرارتیں موجود ہیں۔

غالب ان کا محبوب موضوع ہے۔ ادھر پاکستان میں غالب پر کام کرنے والوں میں یا تو مولانا غلام رسول مہر ہیں یا یہ۔ نہیں نہیں ایک اور بزرگ ہیں جو سی۔ ایس۔ پی بھی ہیں اور ادیب بھی۔ شیخ اکرام ——— ویسے تو اور بھی

ہوں گے مگر باقی قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے غالب پر لکھتے ہیں ان لوگوں نے تو غالب کو سمجھنے کے لیے اپنی زندگی تیاگ دینے کی آرزو کر رکھی ہے۔

میں نے ایک بار حمید احمد خاں صاحب سے شکایت کی "آپ نقوش کے لیے کچھ بھی نہیں لکھتے" بات کو اور باتوں کے ریلے میں دور لے گئے اور میں ہکا بکا رہ گیا۔

ایک بار دوسری کتابوں کے سلسلے میں ان کے پاس پہنچا۔ عرض مدعا کیا بات سنتے ہی ڈوب گئے اور میں تیرتا رہ گیا۔

جب میں نے دوبارہ وہی بات عرض کر دی تو فرمایا۔ "آپ کے لیے لکھ سکوں گا۔ اس لیے کہ آپ حکومت کے نزدیک خوفناک آدمی ہیں اگر آپ کے ساتھ کام کیا تو میں بھی مارا جاؤں گا۔

"اوہو!"

"جی ہاں!"

میں ابھی اب تک یہ نہیں سمجھا سکا کہ میں نے وہ تمام بری باتیں چھوڑ دی ہیں جن کی وجہ سے میں خطرناک آدمی بنا تھا بہرحال میں ایک بار پھر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بارے میں رسمی دریافت کروں گا۔ کیونکہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کے قریب ہو جاؤں — ان سے ادب پڑھوں — اخلاق سیکھوں — شرافت کا درس لوں۔

# میرزا ادیب

دل میں ہزار بدگمانیاں رکھنے والے اپنے میرزا صاحب بے حد شریف النفس اور بڑے بے ضرر دوست ہیں۔ میری طرح یہ بھی دل ہی دل میں کڑھتے اور گھلتے رہتے ہیں، مگر دل کی بات اُن سے نہیں کہتے جن سے شکایت ہوتی ہے کبھی دل کی بات کہہ دی تو اتنے خوفناک طریقہ پر کہ سکتہ طاری ہو جائے۔

ان کی شخصیت میں جو چیز نمایاں اور قابلِ قدر ہے وہ ہے ان کی معصومیت یہی وجہ ہے کہ انھیں اب تک اپنی بڑائی کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ خدا کرے کہ انھیں اپنی بڑائی کا احساس بھی نہ ہو ورنہ ڈر ہے کہیں حواس نہ کھو بیٹھیں۔ موجودہ احساسِ کمتری کے سہارے ہی وہ اس دنیا میں بہ قائمیِ ہوش و حواس چل پھر رہے ہیں۔

میرزا صاحب اپنے سے چھوٹی عمر کے بچوں میں بڑا خوش رہتے ہیں جس نے میٹرک پاس کر لیا وہ ریزلٹ دیکھتے ہی میرزا صاحب کے پاس ادیب بننے کے لیے پہنچتا ہے اور میرزا صاحب اتنے بھلے آدمی ہیں کہ اسے چھاپ چھوپ کر ادیب بنا دیتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا میں بھی میرزا صاحب

کے نقشِ قدم پر چل کر ہر دلعزیز بن جاؤں مگر اب تک اللہ نے مجھے اس کی توفیق نہیں دی۔

میرزا صاحب کے عموماً دو ہی موڈ ہوتے ہیں۔ یا تو آپ سے مل کر بیچھے چلے جائیں گے، یا پھر بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھیں گے۔ بفضلِ خدا مجھے ان کے دونوں ہی موڈوں سے واسطہ پڑا ہے۔

میں نے ایک بار اپنا کوئی نمبر بڑی ہی محنت سے مرتب کر کے میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ میرزا صاحب ورق الٹ پلٹ کر دیکھتے اور پڑھتے رہے شامتِ اعمال پوچھ بیٹھا۔ "میرزا صاحب پرچہ پسند آیا؟"

"ہاں ٹائیٹل اچھا ہے۔"

میں کٹ گیا، جل گیا۔ مگر خاموش رہا۔ بڑے تھے اس لیے احترام لازم تھا۔ کوئی تین چار ماہ بعد میرزا صاحب بھی اپنا سالنامہ لے کر آ نکلے۔ میں ابھی پرچہ ادھر اُدھر سے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرزا صاحب پوچھ بیٹھے۔ "کیسا ہے؟"

"اس کا تو ٹائیٹل بھی اچھا نہیں۔"

میرزا صاحب عموماً دور دور تک پیدل مارچ کرتے ہیں۔ آپ انھیں اس پیدل مارچ میں اکیلا کم ہی پائیں گے۔ کوئی نہ کوئی ناپختہ ادیب ضرور ساتھ ہوگا۔ یہ بڑے ادیبوں سے ان کے گھروں پر اور ناپختہ ادیبوں سے سڑکوں پر ملا کرتے ہیں۔ یوں یہ سبھی کے محبوب بن جاتے ہیں۔

یہ بے حد نیک مگر ضرورت سے زیادہ سادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یار لوگ
ان سے دل لگی سے بھی باز نہیں آتے۔ میرزا صاحب کی آرزو تھی کہ وہ بھی فلمی
کہانیاں لکھیں۔ مدتوں کی خواہش اب پوری ہوئی ہے۔

سنا ہے کہ کسی ستم ظریف ڈائرکٹر نے ایک ایکٹرس سے یہ کہہ رکھا ہے
کہ جب میرزا صاحب آئیں تو ان سے ہاتھ ملایا کرو۔ جب جائیں تو بھی دو چار
میٹھی میٹھی باتیں کر لیا کرو ۔۔۔۔ وہ ایکٹرس اس سے بھی تیز، مکتبۂ اردو ٹیلیفون
کر دیتی ہے ۔۔۔۔ "ہائے میرزا صاحب کہاں ہیں؟ انھوں نے تو یہ وقت مجھ
سے ملنے کا مقرر کر رکھا تھا۔"

اِدھر کارکنانِ مکتبۂ اردو حیران! ۔۔۔ "ہُوں میرزا صاحب!"

میرزا صاحب خود ہی ناراض ہوتے رہتے ہیں، خود ہی راضی ہوتے
رہتے ہیں۔ نہ ان کی کبھی ناراضی کا پتہ چلا نہ راضی ہونے کا۔ یہ گھڑی کے ڈائیل
کی طرح دو کے بعد تین بجاتے ہی رہتے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ ایڈیٹری کم بخت بھی سوتوں والا رشتہ ہے۔ ہزار دامن
بچا کر چلئے اُلجھ ہی جائیے گا۔ وہ کبھی کبھی اپنے پرچے میں میرے اور میرے
پرچے کے خلاف لکھ کر یا لکھوا کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی یہاں اشکا
انداز میں اقرار نہیں کیا کہ میرزا صاحب بے حد مخلص، نیک، پڑھے لکھے دلچسپ
اور قابلِ احترام شخصیت ہیں۔

لیجئے میں نے دومنٹ کے لیے ایڈیٹری چھوڑ دی ۔۔۔ غرض ہے ۔۔۔ جتنی
خوبیاں میرزا صاحب میں ہیں۔ اتنی مجھ میں نہیں۔

# بلونت سنگھ

اتنا تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ سکھ ہیں۔

ان سے میری میٹھی میٹھی سی خط و کتابت ضرور تھی مگر باقاعدہ جان پہچان اس وقت ہوئی جب میں اس خالص پنجابی دوست سے ملنے الہ آباد گیا۔ وہ بھی ان دنوں جب پاسپورٹ کے سو بکھیڑے ہیں۔

الہ آباد اس کے اور میرے پنجاب سے سینکڑوں میل دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بلونت سنگھ سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے جو بات سب سے پہلے پوچھی، یہ تھی۔ "پنجابی دوستوں کا کیا حال ہے؟ فلاں کیسا ہے اور فلاں کیسا —— کیا آج بھی انارکلی میں شام کو ویسی ہی رونق ہوتی ہے؟ کیا لوگ اب بھی شام کو مال روڈ پر ٹہل کر لارنس میں جاکر ٹھیکی بیٹھتے ہیں؟ اور کیا کوئی ایسی صورت نہیں نکل سکتی کہ میں لاہور کو ایک نظر پھر سے جاکے دیکھ لوں؟"

میں سوائے اس بات کے اور کیا جواب دیتا کہ الہ آباد سے امرت سر سینکڑوں میل دور ہے اور امرت سر سے لاہور ہزاروں ہی میل دور!

بلونت سنگھ نے جب مجھے "طفیل جی!" کہہ کر پکارا تو میری روح خوش

ہو گئی۔ اس لیے کہ اس سے پہلے مجھے کسی نے بھی اتنی محبت سے نہیں پکارا تھا صرف اس تخاطب پر ہی ان کے جتنا نزدیک پہلے تھا اس سے زیادہ نزدیک ہو گیا۔
اس لیے کہ ان کی محبت اور ان کا خلوص پہلے ہی قدم پر متوجہ کر کے اپنا چکا تھا

یہ سکھ ہیں، مگر سکھوں کے جانی دشمن —— خود کہتے ہیں کہ سکھ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ پھر سکھوں کے نام سے منسوب کر کر کے وہ وہ من گھڑت اور شاندار لطیفے سناتے ہیں کہ کوئی باور کر ہی نہیں سکتا کہ یہ جو صاحب لطیفے بیان کر رہے ہیں ان کا واسطہ سکھ قوم سے بھی ہو سکتا ہے۔ شاید ابھی تک تارا سنگھ کو یہ معلوم نہیں کہ ان کی قوم میں ایک سکھ ایسا بھی موجود ہے جو سکھوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

بلونت سنگھ بڑے وجیہہ اور خوبصورت ہیں۔ وہ جو منٹو نے موذیل میں ترلوچن سنگھ کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ اگر داڑھی مونچھ منڈوا دے تو کئی لوگ —— اسے آنکھیں ماریں۔" وہ ان پر بالکل ٹھیک بیٹھتا ہے۔

مجھے اس کا تو علم نہیں ہے کہ یہ آدمی کنجوس بھی ہیں یا نہیں۔ مگر یہ رکشا والوں سے پیسے چکاتے ہوئے بڑا لڑتے ہیں —— وہاں کا کیا لوگے؟ —— چار آنے —— دو آنے دوں گا —— رکشا والے کے انکار پر یہ اس منزل کی طرف منہ کر کے چلتے جائیں گے۔ راستہ بھر، ہر رکشا والے سے پوچھتے جائیں گے —— بھئی وہاں کا کیا لوگے؟" ظاہر ہے جب منزل آدھی سے زیادہ پیدل چلتے چلتے ہی کٹ جائے گی تو رکشا والا خود بخود آدھے پیسوں پر راضی ہو جائے گا۔ تب یہ اس پر بڑے فخر

سے سوار ہو جائیں گے اور یہ بھی کہہ دیں گے۔ وہ پہلا چار آنے مانگتا تھا' بیوقوف کہیں کا۔میں نے ان سے شکایت کی۔" آپ مجھے اسٹیشن پر لینے کیوں نہیں آئے؟"

"طفیل جی! مجھے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ آپ آج آنے والے ہیں!"

"میں نے خط جو لکھا تھا!"

"بھئی معاف کرنا' میں نے اپنا پوسٹ بکس لے رکھا ہے۔میری ڈاک اس میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ آٹھویں دسویں دن اُدھر جاتا ہوں تو ڈاک لاتا ہوں۔اس لیے آپ کا خط آ کر بھی مجھے اب تک نہیں ملا۔اب آپ کے جانے کے بعد فرصت ملے گی تو جا کر ڈاک لاؤں گا۔" اگر آپ کا اِس مضمون کا خط مِل گیا تو اسٹیشن ضرور چلا جاؤں گا۔وہاں سے آپ کو لاؤں گا اور اپنے ہاں ٹھہرالوں گا۔ عملاً نہ سہی' ذہناً سہی۔"

ان دنوں ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی' اس لیے یہ پوچھنا ضروری تھا۔" بھابھی کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟"

"آج کل وہ ہے تو اپنے ماں باپ کے پاس' مگر ہے وہ بھی سکھی۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اگر میری والدہ نے میری یہ باتیں سُن لیں تو بہت ہی بُرا ہو گا۔"

"بہت ڈرتے ہیں؟"

"ہاں اس لیے کہ میرا اُن کا معاہدہ ہے کہ میں صرف ان کی بہو کے بارے میں کچھ نہ کہا کروں اور دنیا جہان کی سکھنیوں کے بارے میں جو جی چاہے کہتا رہوں۔"

"اچھا تو یہ موضوع گھر سے باہر زیرِ بحث آئے گا؟"

"منظور!"

پھر اتنا وقت ہی کسے تھا کہ اتنے شاندار موضوع پر بھی گفتگو ہو سکتی۔ بھاگم بھاگ میں جن جن موضوعات پر گفتگو ہوئی اور ان سے میں نے جو نتیجے اخذ کیے وہ یہ ہیں:

محبت کے قابل انسان، مخلص بھولا بھالا، لطیفے ساز، گفتگو میں اناڑی، دوستوں پر بھروسہ کرنے والا، بزدل اور کاہل ہونے کے ساتھ حد درجہ دلچسپ ـــــ اور پیارا۔

واپسی پر جب گاڑی کے چھوٹنے میں وقت بہت ہی کم رہ گیا تو میں نے بوکھلا کر نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ بات کر دی تو انھوں نے بڑے مزے میں کہا ـــ "ہو گیا نا آپ پر بھی سکھوں کا اثر؟"

میں اگر زندگی میں کسی سے شرمندہ ہوا ہوں۔ تو ان سے، اس لیے کہ میں اپنی ایک ذمہ داری کو نبھا نہ سکا ـــ مگر ان کا حوصلہ قابلِ داد رہا ـــ انھوں نے اب جا کر انتقام یہ لیا کہ مجھے خط نہیں لکھتے ـــ میں انھیں راضی کرنے کی کوشش میں ہوں۔ اس لیے کہ قصور وار ہوں۔

# عشرت رحمانی

"جائیے، لے جائیے اپنا کنٹریکٹ، میں مضمون نہیں پڑھوں گا۔"

جن صاحب سے یہ کہا جا رہا تھا۔ جب وہ بہت اچھا" کہہ کر چلے گئے تو میں نے شوکت تھانوی صاحب سے دریافت کیا۔ "آپ کی تعریف؟"

"عشرت رحمانی"

یہ واقعہ ہے لکھنو کا، غالباً ۱۹۴۵ء کا، نہ جانے اس وقت میرے دل میں یہ جذبہ کیوں پیدا ہوا کہ جن صاحب کو شوکت صاحب نے یہ زوردار ڈانٹ پلائی ہے وہ بیچارہ ہے مردِ معقول۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں لاہور چلا آیا۔ عشرت صاحب وہیں ریڈیو اسٹیشن پر رہ گئے۔

دوبارہ لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تو عشرت صاحب کی شوکت صاحب سے پھر گاڑھی چھن رہی تھی۔ اگر عشرت صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شوکت صاحب سے عمر بھر نہ بولتا۔

انہی دنوں عشرت صاحب نے مجھے لکھنؤ ریڈیو پر آنے کی دعوت دی جسے میں نے منظور کر کے نامنظور کر دیا اس لیے کہ جان بوجھ کر ماضر

نہیں ہوا تھا۔

جب میں لاہور آگیا تو انھوں نے مجھے شکایت کا خط لکھا۔ شکایت قطعی حق بجانب تھی۔ اگر میں کوئی لاٹ صاحب ہوتا تو مجھے ایسے نخرے پھبتے بھی، اک ذرا سا لونڈا، اس پر یہ سو سو نخرے، مگر ان ساری باتوں سے مجھے سولہ آنے یقین ہو گیا کہ عشرت صاحب ہیں پیار کے قابل۔۔۔ شوکت صاحب ڈانٹیں تو بھی یہ دوستی کا دم بھرنے سے باز نہ آئیں۔ مجھے بلائیں اور میں حاضر نہ ہو کر حماقت کروں، تو بھی تعلقات جوں کے توں۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ یہ پاکستان بن جانے کی وجہ سے پہلے ڈھاکہ پہنچے پھر لاہور آگئے۔ لاہور آکر، اگر یہ میرے پاس خود نہ آتے تو یہ عشرت تھے ہی نہیں۔ اب میری ان کی گھٹنے لگی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ میں نے انھیں اور انھوں نے مجھے اپنا راز داں سمجھ لیا اور ہم دونوں نے اپنے دیرینہ دوست اور کرم فرما، شوکت تھانوی کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ وہ کہتے شوکت صاحب میں یہ خرابی ہے، میں کہتا یہ، اللہ کی شان کہ ہم دونوں کی اس موضوع پر خوب نبھتی۔ مگر حاصل کلام ہمیشہ یہی رہا کہ یار شوکت صاحب میں جو یہ یہ خوبیاں ہیں، انھوں نے ان کی تمام برائیوں پر پانی پھیر رکھا ہے

عشرت صاحب نے ہمیشہ سب سے دل و جان ہی کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ میں نے بھی جب ان سے کوئی فرمائش کی ہے تو بہتوں سے اچھے

"بسترِ مرگ پر بھی پورا کیا ہے۔" بسترِ مرگ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ پچھلے دنوں انھوں نے ایک بڑی خطرناک چیز کا آپریشن کرایا تھا۔ بہ ظاہر بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ مگر انھوں نے میری فرمائش پہنچنے پر اپنی بے پناہ تکلیف کے باوجود ٹالے بالے کرکے بھی میرا الجھا ہوا مسئلہ سلجھا دیا۔

اپنے عشرت صاحب کی یہ بڑی خواہش ہے کہ سب لوگ مل کر انھیں علامہ کہیں۔ میں نے کئی بار سوچا ہے۔ اگر اور کم بختوں کو اس بات کا خیال نہیں آتا تو میں ہی اپنے دوست کا دل رکھ لوں۔ ہزار کوشش کے باوجود مجھ سے اب تک یہ نہیں ہو سکا۔ اگر عشرت صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ اس قسم کی کوئی بری خواہش ہے تو وہ اپنے فریضہ سے اب تک سرخرو ہو چکے ہوتے۔

جن کے دوست عشرت صاحب ہیں وہ سب خوش نصیب ہیں مگر عشرت صاحب کو ایسے دوست نہیں ملے جن سے ان کی خوش قسمتی کا پتہ چل سکتا۔

پچھلے دنوں عشرت صاحب نے مجھے سُتلی بندھے میلے کپڑوں کا ایک گٹھڑ لاکر دیا کہ اسے اپنے پاس رکھ لو۔ جو میرا رقعہ لائے اسے دے دینا۔ بہت دنوں تک یہ گٹھڑ ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ ایک دن ہمارے عقل مآب ذکر صاحب نے اسے جو سر سے رکھ کر پھینکا تو اس میں سے خوشبو کے بھبکے نکلنے لگے اور ساتھ ہی کوئی چیز بہ نکلی۔ معلوم ہوا اینل کی شیشی تھی۔

جس کے دن آج پورے ہو گئے ہیں تمام کپڑوں کا ستیاناس ہو گیا ——— جو صاحب رقعہ لانے والے تھے وہ رقعہ لائے اور کپڑے لے گئے ظاہر ہے کہ انھوں نے عشرت صاحب سے کپڑوں کی غرقابی کا تذکرہ کیا ہو گا۔ مگر عشرت صاحب کی زبان پر آج تک شکایت نہیں آئی۔ انسان ہو تو اس پائے کا،

یہ دوست بنانے اور دوستی نبھانے میں اپنا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ مجھے تو انھوں نے ہر مرحلہ پر شکست دی ہے۔ یہ اچھے میں بُرا، یہ اپنی قسمت ہی میں تھا۔

# ظہیر کاشمیری

پھٹ پھٹ پھٹ وہ گیا ایک آدمی موٹر سائیکل پر، موٹر سائیکل کی ہیئت بھی عام موٹر سائیکلوں سے الگ اور سوار کی بھی عام آدمیوں سے مختلف، انفرادیت ہی انفرادیت، عموماً بچے موٹر سائیکل کا مذاق اڑاتے ہوئے اور سوار پر ہنستے ہوئے پائے گئے ہیں — مگر وہ سوار ہیں خود اعتمادی کی پوٹ۔ ظہیر کاشمیری۔

گفتار کے امام، دو منٹ بھی انھوں نے کسی سے بات کر لی تو وہ ان کی باتوں سے چکرائے گا بھی اور مرعوب بھی ہوگا۔ چکرائے گا اس لیے کہ یہ چھوٹتے ہی مارکس کی تعلیمات پلانا شروع کر دیتے ہیں اور اشتراکی نقطۂ نظر سے ہر بات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً اگر سڑک پر ایک مزدور سر پہ گٹھڑ اٹھائے ایک صاحب کے پیچھے پیچھے جارہا ہے تو ان کی تقریر یہ ہوگی "لعنت ہو سرمایہ داری پر اور اس معاشرہ پر، جس میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں۔ اصل میں چاہیے تو یہ تھا کہ یہ کمینہ جو صاحب بنا آگے آگے جارہا ہے اس کے سر پہ گٹھڑ ہوتا اور جو پیچھے پیچھے جارہا ہے، اسے آگے آگے صاحب بنے جانا

چاہیے تھا"

لوگ کہیں گے "بات تو ایک ہی ہوئی۔ پھر بھی ایک مزدور رہا اور ایک آقا"

"ہاں صاحب! بات تو ایک ہی ہوئی مگر ایک بار ایسا ہو تو جائے"

ظہیر صاحب کا خیال یہ ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا ہوں اور مارکسی نقطۂ نظر سے سوچنے والوں میں مجھ جیسا جو ہر قابل کوئی اور نہیں ہے۔ نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ اپنے ہی نقطۂ نظر کے ادیبوں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں۔ اگر ہر نقطۂ نظر کے لکھنے والے کو اسی ایک لاٹھی سے ہانک دیتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ ہم کہتے اقبال آپ سے بڑا شاعر تھا۔ یہ کہتے چونکہ اقبال مر گیا ہے اس لیے آپ اسے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ جب میں بھی مر جاؤں گا اس وقت اس بات کا فیصلہ کرنا۔

آج کل یہ میکلوڈ روڈ کے چوک میں، کرسی ڈال کر اپنے ارد گرد تین چار ذہنی بچوں کو بٹھا کر، انگلی اٹھا اٹھا کر، بازو لہرا لہرا کر تقریر کر رہے ہوتے ہیں۔ راہ چلتے لوگ بھی ٹھہر جاتے ہیں مگر ان کی تقریر جاری ہی رہتی ہے۔

خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے مجھے ہمیشہ ہی سے جاہل سمجھ کر بات ہی نہیں کی ہے۔ اگر بات کی بھی ہے تو میری ان کی بنی نہیں ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی اس پر میں نے آج تک غور ہی نہیں کیا ہے۔

اگر انھوں نے بات کی بھی تو اتنی کہ راہ چلتے موٹر سائیکل سے اُترے

اور اپنی تازہ غزل پورے دبدبے کے ساتھ سُنا کر چل دینے۔ میں ابھی ان کی غزل کے تیوروں پر غور ہی کر رہا ہوں، کہ یہ اپنے اگلے پڑاؤ پر۔

جب یہ اپنا کلام سناتے ہیں تو بڑے ہی اعتماد کے ساتھ اور یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھ سے بہتر، کوئی مائی کا لال کہہ کر تو دکھا دے۔

مشاعروں میں لوگ ان کی صورت دیکھ کر منٹ دیں گران کے کلام سے مرعوب ہی ہو کر جاتے ہیں۔ خوب ٹھکے ہوئے پیارے پیارے سے الفاظ لاتے ہیں کہ حل میں اُتر ہی جائیں مگر ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مشاعرے میں ہُوٹ ہو گئے۔

سخت پریشان ہوئے۔ کہنے لگے "دوستو! میں آج تک ہوٹ نہیں ہوا تھا ـــــ اس لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ لوگ اپنی ہوٹنگ واپس لے لیں؟"

"بیٹھ جاؤ!"

"ہائیں!"

# قدرت اللہ شہاب

یہ غالباً ۱۹۵۸ء میں محکمۂ نشر و اشاعت میں سیکرٹری بنے یا گیا، میں نیاز مندی کے شوق میں ان کے پاس پہنچا۔ کارڈ بھیجا۔ جواب ملا۔ انتظار کیجیے۔ انتظار کیا تو بلاوا نہ آیا۔ آہستہ آہستہ خون کھولنے لگا۔ بالآخر یہ رقعہ لکھ کر چلا آیا!

"یہ ناچیز، آپ ایسے لاٹ صاحب سے ملنے چلا آیا تھا۔

آپ کو فرصت نہیں۔ مجھ میں مزید تاب انتظار نہیں۔"

کوئی پندرہ دن کے بعد یہ "لاٹ صاحب" خود میرے دفتر میں آ نکلے اور آتے ہی جو بات کہی وہ یہ کہ "میں آپ سے معذرت کرنے آیا ہوں مگر میں اس دن مجبور تھا۔ ایک بڑی ہی ضروری میٹنگ ہو رہی تھی جس میں خود متعلقہ وزیر صاحب بھی شامل تھے۔ اس لیے آپ کو فوراً بلانا مشکل ہو گیا تھا؟"

ان کی اس معذرت کے بعد نہ صرف یہ کہ انھیں معاف کر دینے کو دل چاہا بلکہ الٹی ندامت ہوئی کہ اتنے عمدہ آدمی کے بارے میں جو میں نے رائے قائم کر لی تھی وہ کس قدر غلط تھی۔

اس کے بعد بہ روز بروز بڑے افسر بنتے گئے مگر انھوں نے اپنی وضع

نہ بدلی۔ جب بھی کراچی سے لاہور آئے اس خاکسار سے ملے بغیر نہ گئے۔ یہ چھوٹوں کے پاس خود جاتے ہیں' بڑوں کو اپنے ہاں حاضر ہونے کا موقع دیتے ہیں۔

کوئی ڈھائی تین برس پہلے یہ جھنگ میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر تھے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا اس نوکری میں تو بڑے ٹھاٹھ ہوں گے۔ کہنے لگے قطعاً نہیں۔ بڑا کام کرنا پڑتا ہے۔ سال ہا سال سے لوگوں کے مقدمے چل رہے ہیں اور بغیر کسی وجہ کے چل رہے ہیں۔ کوئی بھی افسر اپنے فرائض کو نہیں پہچانتا۔ ناداروں اور غریبوں کے لیے کچھ روپیہ حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے' وہ تنگ کارندے کھا جاتے ہیں۔ عجیب مصیبت میں جان آگئی ہے۔ اب میں نے حکم دے رکھا ہے کہ جس کسی کو شکایت ہو وہ مجھ تک براہ راست پہنچے چنانچہ سینکڑوں ہی غرض مند روز پہنچتے ہیں۔ میں ان کی درخواستوں پر متعلقہ افسر کو لکھ دیتا ہوں کہ یہ کام فلاں تاریخ تک ضرور ہو جانا چاہیے۔ اسی طرح برسوں کے لٹکے ہوئے کام چند مہینوں میں ہوئے ہیں — اب ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ناداروں اور غریبوں کا روپیہ خود لے کر نکلتا ہوں اور جن جن کا مقرر ہے انھیں خود اپنے ہاتھ سے دے کر آتا ہوں۔ ورنہ اس سے پہلے روپیہ منظور کسی اور کے لیے تھا اور کھاتا کوئی اور تھا

ایک بڑا دلچسپ واقعہ اور بھی سنایا:

"میں نے ایک مزارعہ کی درخواست پر پٹواری کو لکھ دیا کہ یہ کام فلاں تاریخ تک ضرور ہو جانا چاہیے۔ جب میرے آرڈر لے کر مزارعہ پٹواری کے پاس پہنچا تو اس نے وہ درخواست ہی لے کر پھاڑ دی اور مجھے بھی دو چار سنا دیں۔ اطلاع ملنے پر میں خود اس کے پاس گیا اور اس سے کہا جناب اس غریب کا کام کر دیجیے۔ مجھے بھی اس نے نہ جانچا۔ جب وہ الٹی سیدھی باتیں مجھ سے بھی کرنے لگا تو میرے ساتھیوں میں سے ایک بول پڑا۔ یہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ہیں لہٰذا ادب سے بات کرو ۔۔۔۔ جہاں حالات ایسے ہوں وہاں آدمی بھلا ٹھاٹھ سے نوکری کر سکتا ہے؟"

"آخر آپ نے اس پٹواری صاحب سے کیا سلوک کیا؟"

"بس ہنس کے چلا آیا تھا"

یہ تو ان کی انسان دوستی اور نرم دلی کا حال ہے۔

اتنے نرم دل انسان نے جب بھی قلم سے کام لیا ہے تو اس نے برسائی آگ ہی ہے۔ یہ حکومت کے ہمیشہ بڑے اور اہم عہدوں پر رہے مگر ان کی بیشتر تحریریں حکومت کے خلاف ہی پڑھنے کو ملیں ۔۔۔۔ معاشرہ کی کسی نہ کسی خرابی پر بلا جھجک لکھیں گے، خواہ کچھ ہو جائے۔

انھوں نے ایک کتاب "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" کے نام سے لکھ رکھی ہے۔ وہ چھپواتے نہیں ہیں۔ شاید ڈر گئے ہوں۔ اگر بات یہی ہے تو اس کو

ان کی بزدلی پر محمول نہ کیجئے۔ وہ کتاب ہی انتہائی خطرناک ہو گی۔

ان جیسے سادہ لوح، انسان دوست، بھولے بھالے مخلص اور دیانتدار افسر میری ان گنہگار آنکھوں نے کم دیکھے ہیں۔

# قیوّم نظر

یہ میرے وہ دوست ہیں جن کا کلام سمجھنے کے لیے مجھے کئی کئی چمچے خمیرۂ گاؤزبان کھانا پڑا مگر شعر پھر بھی سمجھ میں نہ آئے۔ ان کی اب تک جتنی بھی چیزیں نقوش میں چھپی ہیں وہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ پیش اس لیے کر دیں کہ اگر کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آتی تو ضروری نہیں ہے کہ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئے۔

یہاں چند ایک ادیبوں کا ایک اکھاڑہ ہے اس کے یہ خلیفہ ہیں۔ اس اکھاڑے میں سبھی پڑھے لکھے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہفتہ واری ان سب کے علم کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دور دور سے لوگ ان کے علم سے استفادہ کی خاطر آتے ہیں مگر اپنی بے علمی کی بنا پر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میرا مشورہ تو ان دوستوں سے (خاص کر قیوّم صاحب سے) یہ ہے کہ اپنے علم کو لوگوں کی سطح پر لے آئیں جیسے جیسے پبلک کا شعور بڑھے خود بھی سیڑھیاں چڑھتے جائیں ورنہ کسی دن یہ ہوگا کہ اس اکھاڑے کے تمام ادیب قطب مینار پہ چڑھ جائیں گے اور مجھ جیسے کم علم

---

ہ مجھے اس "اکھاڑے" کی افادیت سے انکار نہیں۔

ادب کے چٹیل میدان میں کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔

قیوم نظر سے میری دوستی بڑی پرانی اور شراب کہنہ کی طرح قیمتی ہے کوئی ناراض ہو تو قہقہے لگانے والا، کوئی خوش ہو تو قہقہے لگانے والا آجکل بہت فکرمند ہے اس لیے کہ حکومت پاکستان نے میرے اس پیارے دوست کو خواہ مخواہ پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے پورے یورپ کے دورے پر بھیج دیا ہے۔ ان کی پریشانی کی وجہ میرے نزدیک تو یہی ہوسکتی ہے کہ ان کے پائے کا باہر کوئی ادیب نہ ہوگا۔ اب یہ بات کریں گے تو کس سے، یہاں تو انھوں نے بہ ہزار وقت چند ایک دوست ایسے ضرور پیدا کر لیے تھے جو ان کے علم سے پوری طرح آگاہ تھے۔

یہ ان تمام ادیبوں کے خیرخواہ نہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ کہتے ہیں ہم پنجابی بولتے ہوئے اُردو میں لکھتے ہیں، یہ اُردو بولتے ہوئے اُردو میں کیوں لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بڑے پیار میں اُردو بولنے والوں کو سناتے رہتے ہیں۔ میں بھی مزے لیتا ہوں یہ بھی، مگر اتنے تعلقات کے باوجود مجھے اب تک اس قابل نہیں بنا سکے کہ میں بھی ان کا ہم زبان بن سکتا۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ ان کی طبیعت میں بڑی قلندری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قطعی جوڑ توڑ کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ سال ہا سال سے اسی ایک اکھاڑے کی سرداری ان کے سر تھوپی جا رہی ہے۔ یہ غریب ہیں کہ اپنے فرض کو نبھا رہے

ہیں۔ انتظامی معاملات کی بھی ان میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکھاڑے میں جو کوئی دو ہاتھ دکھاتا ہے اسے بذریعہ ریزولیوشن خارج کراتے جاتے ہیں۔

اگر کسی ہوٹل میں ایک میز کے ارد گرد پندرہ بیس نیازمند بیٹھے ہوں اور زوردار قہقہے ہوٹل کے کمرے سے، باہر کی طرف بھاگ رہے ہوں تو یہ سمجھ لیجیے اس محفل کا امام قیوم نظر ہے جو اپنا بہترین دوست ہے۔

یہ سب کے سب چائے پئیں گے، چاپس کھائیں گے۔ جب بیرا بل لے کر آئے گا تو یہ سب سے مساوی مساوی پیسے اکٹھے کریں گے اور چائے کا بل ادا کر کے بیرے کو ٹپ اپنی طرف سے کر دیں گے۔

میری بدقسمتی کہ اب یہ زیادہ مصروف ہو گئے ہیں اور میرے پاس کم آنے لگے ہیں۔ بیچ میں تو بالکل ہی آنا بند کر دیا تھا۔ پھر میں نے منت خوشامد کر کے ان کی آمد کو چالو کیا ہے۔ یہ آجاتے ہیں تو میں دو گھڑی ہنس لیتا ہوں۔

یہ یورپ کا دورہ کر کے آجائیں تو سوچتا ہوں میں بھی، شیرینی اور پگڑی لے جا کر باقاعدہ ان کا چیلا بن جاؤں۔ دوستی اپنی جگہ، یہ سلسلہ اپنی جگہ اگر میرے کسی بدخواہ نے میرے اس ارادے کو فسخ نہ کرا دیا تو میری دنیا ضرور سنور جائے گی۔

قیوم صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ باہر جا کر مجھے ضرور خط لکھیں گے اگر انھوں نے مجھے خط لکھا تو میں جواباً یہ ضرور لکھ دوں گا کہ میں نے آپ کی زندگی کا مطالعہ کر کے اب یہ عہد کر لیا ہے کہ باقی زندگی میں مَیں آپ ہی کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔

میں نے دیکھا ہے کہ اگر کوئی اُصولی مسئلہ سامنے آجائے۔ تو پھر یہ ذاتی جھگڑوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ یہ گریٹ نس تو ہے ان میں۔

زندگی میں ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھی کبھی کبھی شعر مکمل کرنے کے لیے دوسرا مصرع کہہ ڈالا ہے۔

# ابراہیم جلیس

یہ حیدر آباد دکن کی یادگار ہیں۔ جب پولیس ایکشن ہوا تو یہ ریڈیو اسٹیشن پر اس وقت بھی ہندوستانی سامراجیوں کو رضاکاروں کے مقابلہ میں پیچھے دھکیل رہے تھے۔ اسی بہادری کی بنا پر انھیں پاکستان آنا پڑا۔

انھوں نے آتے ہی اپنا روزنامچہ بڑے دلچسپ انداز میں لکھ کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں پڑھ ڈالا۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ مطلب یہ کہ یہاں کے ادیبوں نے انھیں سر پر چڑھا لیا۔

سو خوبیوں کی ایک خوبی ان میں یہ ہے کہ انھیں اپنے ملنے والوں کو بیوقوف ہی بنانے کی دُھن سوار رہتی ہے۔ کوئی سنجیدہ بات ہو رہی ہو گی تو یہ فقرے بازی پر اُتر کر اس مسئلہ کی اہمیت ہی کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔ موضوع اگر ٹھٹھے مخول کا ہو تو ایک دم سنجیدہ ہو جائیں گے، جیسے معقولیت ان پر ختم ہو۔

جب یہ لاہور سے کراچی چلے گئے تو خیال تھا کہ حیدر آبادی ہیں، بدل گئے ہوں گے مگر ملاقات ہوئی تو یہ وہی جلیس تھے جو اس سے پہلے لاہور میں تھے۔ وہی زندگی، وہی ہنسی مذاق اور وہی سنجیدگی، مگر اتنے پُر انھیں ضرور لگ

گئے تھے کہ چین ہو آئے تھے۔

مجھے چین کی یہ چیز دکھائی وہ چیز دکھائی۔ سامان دکھایا، فوٹو دکھائے، اور ان میں سے ایک فوٹو نکال کر اور ایک لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھ کر "خوب لڑکی تھی یہ بھی، کاش میرے ساتھ آسکتی۔ مجھ سے تو جدا ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب سے یہاں آیا ہوں اس کے چار خط آچکے ہیں میں نے فوراً جواب دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ فوراً یہاں آجاؤ۔ میرا بنگلہ حاضر ہے میری گاڑی حاضر ہے۔"

میں ان کے اس انکشاف پر حیرت زدہ بن گیا کہ یہ خود تو ہوٹل میں کرایہ پر رہتے ہیں، سواری کے لیے رکشا والے کی منت خوشامد کرتے ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟

"کیا یہ دونوں چیزیں بھی آپ کو چینی حکومت نے دی ہیں؟"

"ابھی نہیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب بنگلہ ضرور بنواؤں گا، موٹر ضرور خریدوں گا اس لیے اسے بلا رہا تھا کہ آکر اپنی چیزیں سنبھالو"

"اچھا تو جناب! یہ بنگلہ اور موٹر تو بعد میں خرید لیجیے گا ——— مذاق ختم — مجھے آج کل میں ایک افسانہ ضرور لکھ دیں"

تمہارے منہ میں گھی شکر۔ آج کل میں پیسوں کے ہاتھوں بہت پریشان تھا۔ "روپے ضرور لیں گے مگر جیسا افسانہ ہوگا اتنے"

تھے۔"

دوسرے دن شام کو ایک افسانہ لائے۔" بھئی طفیل افسانہ سنو۔ ایک سو روپے والا افسانہ لایا ہوں۔" افسانہ سُنانے کے بعد پوچھا۔" کہو کیا قیمت لگاتے ہو؟"

"پوری ایک اکنی ـــــ میں نے شرارتاً کہا۔

بے اختیار قہقہہ لگایا جسے اڑوس پڑوس میں سب نے سُنا

اسی دن کسی کالج میں مشاعرہ تھا۔ مجھے ساتھ لے گئے۔ میں نے ان سے کہا، میرا کسی سے تعارف نہ کرایئے گا جو مجھے جانتا ہو گا اس سے میں خود مل لوں گا۔ نئے تعارف نہیں چاہتا۔"

"بہت اچھا۔"

مشاعرہ شروع تھا۔ اب جس شاعر کا نام پکارا جائے اس کے بارے میں ان کے اس قسم کے ریمارک سننے پڑتے۔ مثلاً اس شاعر کی بیوی بڑی خوبصورت ہے اس لیے اس کی اور اُس کی نہیں بنتی اور اس کی ساری شاعری بیوی کے فراق میں ہوتی ہے ـــــ دیکھنا یہ شاعر جو اُٹھ رہا ہے آج طے کر کے آیا ہے کہ پبلک ہی کو ہوٹ کر کے جاؤں گا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے اس بیچارے کو پبلک ہی ہوٹ کرتی چلی آئی ہے۔

مشاعرہ ختم ہوا تو اس کے بعد کالج کی طرف سے کھانے کا بھی انتظام تھا

جو جند ایک میرے جاننے والے تھے ان سے چو ری چوری مل ہی چکا تھا ـــــــ

کھانا ایک میز پر دھرا تھا، سب نکال نکال کر بڑے انہماک سے کھا رہے تھے۔ صرف چمچے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں، ورنہ تھا کامل سکوت، کہ یہ پھٹ سے میری طرف اشارہ کر کے بول پڑے ـــــ "حضرات! یہ صاحب جو بہت تیزی سے کھا رہے ہیں ان سے میں نے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں ان کا کسی سے تعارف نہیں کراؤں گا۔"

جلیس صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ بس اتنا چاہتے ہیں کہ سب لوگ مجھے بڑا لکھنے والا مانیں اور میری جھوٹی باتوں پر بھی یقین کر لیں۔ ان دو خواہشوں کے علاوہ ان کی کوئی تیسری خواہش نہیں ہے۔ وہ بنگلے، موٹر اور لڑکی والی بات ان کی خواہش میں شامل نہیں ہے۔ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ انہی دو باتوں پر ساری زندگی گذار لیں گے۔

جلیس صاحب مجلس کی جان ہیں۔ خوب صورت باتیں کرنے میں خلوص کی زیادتی ہو تو ہو، کمی تو بالکل نہیں۔ ایک بار کی ملاقات بھی اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے اپنا بنا لیتی ہے۔ میں بھی جلیس صاحب کی باتوں اور ان کے خلوص کا اسیر ہوں

# سیف الدین سیف

میری ان سے آج سے چودہ پندرہ برس پہلے جب یہ کالج ہی میں پڑھتے اور خاکسار تحریک سے عملاً تعلق رکھتے تھے، امرتسر میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ان کی شاعری کی بسم اللہ کا دور تھا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے مجھے اپنی دو تین چیزیں بڑی ہی بے یقینی کے ساتھ سنائی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ میں نے اپنی پہلی 'کوشش' 'ادبی دنیا' میں بھیجی ہے۔ دیکھیے چھپتی ہے یا نہیں۔ مجھے آج بھی اُردو شاعری اور اس کی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کا کچھ پتہ نہیں ہے، اُس وقت خاک ہوتا۔ اس کے باوجود مجھے سیف صاحب کے شعر بہت اچھے معلوم ہوئے تھے۔ مجھے خوشی تھی تو اس بات کی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا۔ ان کا سنانا ایسا بھاگوان ثابت ہوا کہ آج تک شعر ہی سنتا چلا آرہا ہوں۔ مجھے تو اس حد تک یقین ہوگیا ہے کہ اِدھر میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی ہوگی اور اُدھر شاعر میرے سرہانے بیٹھا کہہ رہا ہوگا۔ شفیق صاحب! ذرا ایک منٹ رُک جائیے اور یہ مقطع ضرور سُن جائیے۔

اب سیف صاحب تو مجھے شعر سنانے کی "جاگ" لگا کر، خود کسی کو سنانے کے قائل ہی نہیں رہے۔ بہت ہی زیادہ اصرار پر کسی کو دو ایک شعر سنا دیئے تو سنا دیئے ورنہ نہیں۔

سیف صاحب کا شمار اب اُونچے لوگوں میں ہے جن کی آواز پر دس پندرہ آدمی ایک سیکنڈ میں اکٹھے بھی ہو سکتے ہوں اور جو یہ کہیں، وہ حکم کی بجا آوری میں اپنی سعادت بھی سمجھتے ہوں۔

پانچ چھ برس کی بات ہے کہ رتی ہیلی مینشن والوں نے ان سے مکان خالی کرانا چاہا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ وہ پولیس لے آئے تو بھی یہ مرعوب نہ ہوئے۔ ایک ہنگامہ ہو گیا۔ دو چار سو آدمی ان کے اکٹھے ہو گئے، پولیس کی بھی لاریوں پہ لاریاں آنی شروع ہو گئیں۔ پولیس مردہ باد اور رتی ہیلی مینشن مردہ باد کے نعروں میں ہزاروں ہی آدمی شریک ہو گئے۔ ٹریفک بند ہو گئی پولیس کو متنبہ کر دیا گیا۔ اگر زبردستی کی تو نتائج کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔ شورش کاشمیری ایک اُونچی جگہ کھڑے ہو کر حکومت کے خلاف تقریر کرنے لگ گئے۔ شیم شیم کے نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ اس وقت کے گورنر جناب عبدالرب نشتر کو بہ ذات خود مداخلت کرنی پڑی۔ پولیس لاریوں میں بیٹھ بیٹھ کر اسی جگہ چلی گئی جہاں سے آئی تھی ----- لوگوں نے آخری نعرہ جو لگایا وہ یہ تھا۔ سیف الدین سیف زندہ باد۔

اب یہ ادب سے زیادہ فلم کی طرف متوجہ ہیں۔ پہلے انھوں نے فلمی گانے دوسری فلم کمپنیوں کے لیے لکھے اب اپنے لیے لکھتے ہیں اور اپنے ہی سرمایہ سے فلمیں بھی بناتے ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ یہ اور ابوالاثر حفیظ جالندھری موٹر سے اترے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں پہنچے وہ سیف صاحب کا گھر تھا۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر ایک سے ایک ایکٹرس اور ایک سے ایک ایکٹر پڑا نظر آرہا ہے۔ طبیعت ایک دم خوش ہو گئی۔ روز ادیبوں اور شاعروں کی پریشان صورتیں دیکھ دیکھ کر جو کوفت ہوا کرتی تھی وہ ان دمکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر کافور ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد بڑا ہی پُرتکلف کھانا ملا۔ ایکٹروں ایکٹرسوں کے بیچ میں بیٹھ کر اور کبھی انہیں دیکھ کر اور کبھی کھانے کو دیکھ کر جو چند لقمے کھائے اس کا لطف آج بھی نہیں بھولتا۔

اس کے بعد حفیظ صاحب نے اپنا کلام عہد بہ عہد سُنایا۔ کچھ ماحول ایسا تھا اور کچھ حفیظ صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا۔ حفیظ صاحب نے اپنا کلام ترنم سے بھی پڑھا، گا کر بھی پڑھا۔ پڑھا اور خوب پڑھا۔ سامعین سے داد بھی ایسی مل رہی تھی کہ سننے والوں کا بھی دل خوش ہوا جا رہا تھا۔ یہ محفل کوئی صبح تین بجے تک رہی ہو گی۔

سیف صاحب غزل میں اپنا بڑا اونچا مقام سمجھتے ہیں اور شعر و شاعری کو خالہ جی کا گھر نہیں سمجھتے۔ ہر شاعر کی ذہنی اڑان سے لے کر لفظوں کے انتخاب اور غزل کے مزاج پر گھنٹوں بڑی عمدہ باتیں کر سکتے ہیں۔

نقوش کے کسی نمبر کے لیے سیف صاحب نے وعدہ کر رکھا تھا کہ غزل دوں گا۔ حاضر ہوتا تو ملاقات ہی نہ ہوتی۔ تیسری چوتھی بار ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ نئی غزل کوئی ہے ہی نہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر انھوں نے کچھ سوچا، نوکر سے پان اور سگریٹ منگوائے اور مجھے آدھ گھنٹہ بیٹھ جانے کے لیے کہہ دیا۔ چنانچہ میرے بیٹھے بیٹھے سات شعر کی ایک خوبصورت سی غزل کہہ کر میرے حوالے کر دی —— میں تو آمد کا قائل ہو گیا۔

سیف صاحب کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں اور یہ ہیں بھی تعریف کے قابل، مگر منہ پھٹ بہت زیادہ ہیں، کسی کا دل رکھنے کے لیے بھی رعایت نہیں برتتے۔

# اے حمید

گلاب کے پھولوں اور رومانی داستانوں کے تذکرہ نگار، اے حمید کو نہ تو میں زیادہ جانتا ہوں اور نہ زیادہ پہچانتا ہی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آٹھ نو برس سے ایک دوسرے کو جانتے چلے آ رہے ہیں۔ اکٹھے بھی بیٹھے ہیں، باتیں بھی کی ہیں، خوش ہونے والی باتیں بھی اور لڑنے والی باتیں بھی۔

ابھی انھوں نے افسانے لکھنے شروع ہی کیے تھے کہ یہ خوب بنے ٹھنے ہمارے دفتر کے سامنے سے گزرے۔ ان دنوں ہمارے ہاں ایک ایسے صاحب کام کرتے تھے جو ان کے واقف تھے۔

وہ صاحب ان سے مل کر واپس آئے تو مجھ سے پوچھا ــــ "انھیں جانتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"اے حمید ہیں یہ، ادبِ لطیف کے افسانہ نگار۔"

"ہوں گے! یہاں افسانہ نگاروں کی کونسی کمی ہے۔ کمی ہے تو اچھے افسانہ نگاروں کی۔"

غالباً میری یہ بات اللہ میاں نے سُن لی اور انھیں اچھے افسانہ نگار کی تمام

صلاحیتوں سے نواز دیا۔ بعد میں اس خوبصورت خط و خال کے افسانہ نگار نے بڑے بڑے خوبصورت افسانے لکھے جو لڑکپن سے نکلتی ہوئی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو بہت بھائے۔ اے حمید بزرگوں اور بزرگنوں؟ کا افسانہ نگار نہیں ہے۔ یہ تو چودہ برس سے لیکر ۲۰، ۲۵ برس تک کی اُبلتی جوانیوں کا افسانہ نگار ہے۔

یہ آپ کے سامنے سے گزر جائیں تو بڑے ہی سنجیدہ معلوم ہوں گے سلام دعا ہو گی تو بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ، مگر اصلی اے حمید آپ کو اس وقت نظر آئے گا جب اس کے سامنے سبز نمکین چائے اور باقرخانی پڑی ہو اور ساتھ ہی امرتسر کے دو چار دوست دائیں بائیں ٹکے ہوں اس وقت ان کی زبان تلوار کی کاٹ کا کام دے گی اور دل فرہاد و وامق کی یاد دلائے گا۔

اے حمید قہقہے لگانے کے عادی ہیں مگر روح مایوسیوں اور نامرادیوں سے کچلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اگر نظر آنے لگیں گے تو دن میں چار بار بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ غائب ہونے پر آئیں گے تو چار مہینے میں ایک بھی ملاقات نہ ہو گی۔

لوگ گرمیوں میں پہاڑوں پر جاتے ہیں یہ سردیوں میں! سردیوں میں جب برف پہاڑوں پر گرتی ہے تو ان کا دل سنبھلنے لگتا ہے۔ میدانوں میں جب لوگ مارے سردی کے ٹھٹھر ٹھٹھر جاتے ہیں تو یہ شدید برفباری میں بھی اپنا سینہ تان دیتے ہیں۔ غرض اٹھتی جوانی میں نیا خون بھرا ہوا ہے اس لیے یہ ساری کلیلیں اسی کے دم سے ہیں ـــــ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کوئی دو برس سے کسی بھی پہاڑ پر نہیں گئے

ہوں گے۔ اس لیے کہ اپنے افسانے کا ہیرو بن کر جب انھوں نے خود ہی شادی کر لی ہے تو اب ہیروئن ہی خود شب بن کر ان پر گرتی ہوگی۔

انھوں نے اپنی زندگی میں کئی پلان بنائے مگر سوائے ناولیں لکھنے کے ان کا کوئی پلان سرے نہ چڑھا۔

ظہیر کاشمیری اور انتظار حسین کی طرح، میں نے انھیں کبھی اپنی تعریف کرتے نہیں سنا۔ افسانہ لکھ کر ادبی میٹنگوں میں سنایا تو چپ، دوسرا افسانہ لکھ کر رسالے میں چھپوایا تو چپ، کسی نے تعریف کر دی تو چپ، کسی نے ناک بھوں چڑھائی تو چپ، ورنہ ادھر میں نے کئی ادیب اور شاعر ایسے بھی دیکھے ہیں کہ وہ کوئی چیز بعد میں لکھتے ہیں، ہنگامہ پہلے کرا دیتے ہیں۔

# اشفاق احمد

جب یہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اس وقت یہ بڑے ہی اچھے آدمی تھے۔ البتہ اس وقت اتنے اچھے افسانہ نگار نہ تھے۔ اس کے بعد جب یہ خود ایک کالج میں اُردو کے لیکچرر مقرر ہوئے تو خود کہنے لگے۔ "اب ذرا میں معقول آدمی بننا چاہتا ہوں۔" یہ معقول آدمی تو ضرور بنے مگر وہ جو چیز دوستی کی روح ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی۔

ان کا اپنی ذات کے بارے میں جو یہ خیال ہے کہ میں بڑا بیوقوف قسم کا انسان ہوں، بڑا غلط ہے۔ مرورِ زمانہ کے باوجود بہت سارا پیارا دوست، مخلص ہی مخلص، محبت ہی محبت قسم کا برانڈ۔ خوبصورت باتوں کا بادشاہ، باتیں افسانوں ہی کی طرح سے دلکش، پیچ در پیچ اتنی کہ تسلسل ٹوٹنے ہی نہیں پاتا۔ ریکارڈ کی طرح بجتے ہی چلے جائیں گے۔ ایکٹنگ بھی ایسی غضب کی کہ ہاتھوں کے سارے طوطے اڑ جائیں اور مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

ان کا یہ انداز ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتا۔ نئے ملنے والوں سے دلہن کی طرح شرماتے ہیں۔ پرانا ملنے والا مل جائے تو بازار ہی میں کھڑے کھڑے

اتنا ستائیں گے اتنا ستائیں گے کہ راہ گیر کم ازکم دونوں میں سے ایک کو تو ضرور پاگل سمجھے گا۔

یہ اپنے زیادہ قریبی دوستوں کو بڑی محبت کے ساتھ کمینہ، حرامزادہ، اُلّو کا پٹھا ضرور کہیں گے۔ اگر یہ تینوں القاب کسی پر صرف نہ ہوئے ہوں تو وہ ان کے بے تکلف دوستوں میں سے نہیں ہے اور یہ اندازِ تخاطب ہر کسی کو نصیب بھی نہیں ہو سکتا۔ اب میرے ان کے کوئی آٹھ برس کے تعلقات ہیں لیکن انہوں نے مجھے اب تک اس قابل نہیں سمجھا کہ ان میں سے ایک آدھ لفظ ہی کا مستحق سمجھا جاؤں۔

قلندری طبیعت میں بہت ہے۔ بے حد سادہ رہتے ہیں۔ گیروے رنگ کا سیدھا سادا کُرتہ، شلوار اور دونوں پاؤں میں ایک ایک چپل، اسٹالن نما مونچھیں اور چہرہ مہرہ بھی۔ آج کل اسٹالن سے انھیں تشبیہ نہیں دینا چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اس بے چارے پر وہ وہ الزامات ان کے دوستوں نے لگائے ہیں کہ اشفاق صاحب بھی شرمانے لگ گئے ہوں گے۔ اس لیے ان میں چہرے مہرے کے علاوہ ایک عیب بھی اسٹالن والا نہیں ہے۔

مکان کی تیسری منزل پر ان کے گھر والوں نے انھیں ایک کمرہ دے رکھا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں جب دن کے بارہ بجتے ہیں تو یہ سارے کپڑے اتار کر افسانہ لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پسینہ بہتا جاتا ہے اور یہ لکھتے جاتے ہیں۔ اگر

گھر میں باہر سے مہمان وغیرہ آجائیں تو یہ لارنس گارڈن میں جاکر، ایک درخت کے نیچے بیٹھ جائیں گے اور افسانہ لکھنا شروع کر دیں گے۔ خواہ کیڑے مکوڑے چڑھ دوڑیں، چیونٹیاں کاٹ کھائیں یہ لکھتے جائیں گے۔ جب افسانے کا آخری لفظ تک لکھ لیں گے۔ تب ایک آدھ چیونٹی کو انگلیوں میں مسل کر کہیں گے، حرامزادی کمینی، اُلّو کی پٹھی!

جب میں نے اشفاق صاحب پر، یہ چند سطریں لکھی تھیں۔ اس وقت اشفاق صاحب میری ہی سطح کے آدمی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بے تکلفی ہی بے تکلفی میں ساری باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ اب یہ مجھ سے اونچے ہو گئے ہیں۔ اس لیے مجھے ان پر نیا مضمون لکھنا چاہیئے تھا۔ جس میں کچھ زیادہ رکھ رکھاؤ ہوتا۔ مگر آپ کو وہی پرانی تحریر پڑھنے کو مل رہی ہے۔ ہائے کم فرصتی!

# انتظار حسین

ننھے سائز کے انتظار حسین سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تو ان کے قد اور جُثّے نے حیرت میں ضرور ڈالا۔ باتیں ہوئیں تو یہ انکشاف بھی ہُوا کہ آدمی اتنا پڑھا لکھا ضرور ہے کہ مجھ ایسے جاہل کو مرعوب کر سکے۔ باتیں ہی تو اس کا سارا آرٹ ہیں۔ اپنے مضمونوں میں بھی تو بغیر دلائل کے باتیں ہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ باتیں ہوتی ہیں بامحاورہ اور چٹپٹی، جس دن کسی نقّاد نے ان کے مضمونوں سے ان کی باتوں کو الگ کر دیا اس دن انتظار حسین گوشہ نشین ہو جائیں گے۔

نہ جانے یہ کیا بات ہے کہ ہزار محبّت کے باوجود ان سے ٹھنی ہی رہتی ہے۔ ہم ایک دوسرے پر فقرے چسپت کر کے دلی سکون حاصل کرتے ہیں۔ وہ اہلِ زبان اور میں بے زبان، کاہے کو پُورا اترتا ہوں گا۔ مجھے جو غصّہ آتا ہے تو وہ یہی کہ اگر اس ذرا سے آدمی سے مات کھائی تو محلّے کے لونڈے بھی مجھ پر بہ آسانی فقرے چسپت کر لیا کریں گے۔

انتظار صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ جتنے ادیب چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان میں ایک بھی ادیب نہیں ہے۔ اِس سلسلے میں ان کا ریکارڈ بڑا اچھا ہے۔

جو بھول کر بھی انھوں نے کسی کو ادیب مانا ہو۔ ایک دن بیٹھے انتظار صاحب یہی باتیں کر رہے تھے کہ سب کے سب ادیب جاہل ہیں، تو میں نے ان سے یہ درخواست کر دی تب تو آپ ان سب کے امام ٹھہریں گے۔

یہ دو دھاری تلوار ہیں۔ دوستوں سے بھی ہنس ہنس کے بات کریں گے اور دشمنوں سے بھی، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ باتیں کس کھاتے میں سے پیش کی جا رہی ہیں۔ لوگ ان کے جانی دشمن ہوتے ہوئے بھی ان سے علیک سلیک ختم نہیں کرتے۔ اگر دوسرا ختم کر دے گا تو یہ ختم نہ ہونے دیں گے۔

ویسے یہ بیچارے بھی میری ہی طرح بے ضرر اور غیر مفید الّسان ہیں۔ ان کی دشمنی سے نہ کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، نہ ان کی دوستی سے کوئی فائدہ۔ دشمنی میں زیادہ سے زیادہ تیر ماریں گے تو کسی کے خلاف ریڈیو لکھ دیں گے، دوستی پر اتریں گے تو اسے ایک کپ چائے پلا دیں گے۔

میز کے گرد بیٹھے ہار پڑ کو روتے رہیں گے۔ ہائے کیا لوگ تھے وہ بھی اور کیا زمانہ تھا وہ، اب بجّو کی ریوڑیاں نہیں ملتیں، بجّو کے پاپڑ نہیں ملتے، بجّو کی گزک نہیں ملتی، بجّو کے دہی بڑے نہیں ملتے۔

سو خوبیوں کی ایک بات ان میں یہ دیکھی کہ انھوں نے کبھی حالات کی ناسازگاری کا رونا نہیں رویا۔ بے کار رہے تو چہکتے رہے۔ بھوکے رہے تو پھدکتے رہے۔ ویسے یہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور چاہتے ہیں۔ ماحول پُرسکون

ہو تو انھیں بے چینی ہوتی ہے چاہتے ہیں کہ کچھ کروں تاکہ لوگ متوجہ ہوں۔ خواہ اس کے لیے کوئی ناشائستہ حرکت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

جن سے مل کر میرا دل خوش ہوتا ہے ان میں ایک انتظار حسین بھی ہیں۔ اگر مجھے کسی پریشانی نے نڈھال کر رکھا ہو، مایوسی کا کوئی پہاڑ سامنے ہو تو میں، انتظار حسین کی تلاش میں نکلتا ہوں اور انہیں ڈھونڈھ لینا کوئی مشکل نہیں ہوتا کسی نہ کسی ہوٹل میں مل جائیں گے، کسی پنواڑی کی دکان پر مل جائیں گے، کسی کالج کے طالب علم کو مرعوب کرتے ہوئے مل جائیں گے۔ مگر ملیں گے ضرور! ان کے گھر والے دن میں ان کی شکل دیکھ لیں تو دیکھ لیں رات کو ان کے بسیرے سڑکیں اور ہوٹل ہوں گے۔

# ناصر کاظمی

میری ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب یہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ کالج میں دو لڑکوں کا بڑا چرچا تھا۔ ایک ان کا دوسرے حمید نسیم کا، کالج میں جن لڑکوں کے چرچے ہوتے ہیں ان کی وجوہ عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ ان کا چرچا کیوں تھا، بات سمجھ میں نہ آئی۔ نہ شکل و صورت نہ ذہانت، شکل و صورت تھی تو ایسی جیسے کوئی ہالی ووڈ کا جواری ہو اور ذہانت بس اتنی کہ کام چل جائے۔

ان دنوں بس یہی سرسری سا ہی تعارف ہوا تھا۔ اس وقت انھوں نے چڑھی پتنگ کی طرح شانے ہلا ہلا کر کچھ مرعوب کرنا چاہا۔ اپنی امارت کی طرف اشارے بھی کیے اور دوسرے لڑکوں سے اپنے آپ کو الگ سا بھی بتایا۔

پاکستان کی بدولت یہ کھاتا پیتا شاعر اسی لاہور میں آگیا۔ جس میں اس کی امارت سے بہت سے مرعوب تھے۔ مگر اب امارت اُدھر رہ گئی تھی اور یہ ادھر آ گئے تھے۔ برسوں سے دھکے کھا رہے ہیں اور شعر کہہ رہے ہیں۔

انتظار حسین ان کی بڑی کمزوری ہیں۔ اکیلے ہوں تو یہ انھیں اور وہ انھیں

ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جب دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی ٹی ہاؤس میں بیٹھ جاتے ہیں ورنہ ایک دوسرے کو ساری ساری رات ڈھونڈتے ہی میں گذار دیتے ہیں۔

ویسے ایسا ہوتا کبھی کبھی ہی ہے۔ جب تک ان دونوں کے مشاغل آپس میں نہ ٹکرائیں یہ نوبت نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے اب دونوں نے کچھ وعدے وعید کر رکھے ہیں کہ اگر مشاغل ٹکرا بھی جائیں تو بھی ایک دوسرے کو صورت دکھانا ہے ضروری۔

ناصر صاحب بلاشبہ مزے دار آدمی ہیں پور قطعی نہیں ہیں۔ ورنہ شاعر چند ایک کو چھوڑ کر میں قدم دور اپنے اوصاف سمیت پہچان لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے ملنے والوں میں ضرورت کی حد تک ہر دلعزیز ہیں۔ اگر ہر دلعزیز نہیں ہیں تو صرف ان میں جو خود کو غزل کا شاعر سمجھتے ہیں۔

ان کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں پوری معصومیت لیے ہوئے۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فلاں ادیب کی فلاں آدمی سے نہیں بنتی تو اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے اور سگریٹ پر سگریٹ پیتے ہوئے پوچھیں گے۔ وہ چیز دیکھی؟ بات بنی نہیں اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر مخاطب کی ردی سی چیز پر تبصرہ ۔۔۔ واہ وا ۔۔۔ سبحان اللہ ۔۔۔ بات ہوئی نا کوئی! بخدا جو سلیقہ اور ڈھنگ آپ کو کہنے کا ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی اسے نہیں پہنچا۔ دیکھئے نسب

پندرہ برس بعد آپ مر جائیں گے تو اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

یہ دن کو سوتے ہیں اور راتوں کو جاگتے ہیں۔ جب میں بھی ان کا تھوڑا
بہت ہمراز تھا تو مجھے معلوم تھا کہ یہ رات کے اتنے بج کر اتنے منٹ پر کہاں
ملیں گے اور اتنے بج کر اتنے منٹ پر کہاں۔ جیسے جیسے سورج کے نکلنے کا وقت
قریب آتا ان کے ٹھکانے غیر یقینی ہوتے جاتے

اُن دنوں ان کی جیب میں ایک چھوٹی سی پنسل ہوتی تھی۔ چائے کے بِ
ل پر دستخط کر کے سرخرو ہو گئے۔ اس طرح ان کی ساری رات بلوں پر دستخط
کرتے گزر جاتی تھی۔ ہوٹل والوں کے سینکڑوں روپے ہو گئے تو بھی وہ مطمئن
جانتے ہیں۔ پیسے ڈوبیں گے نہیں

بزرگوں کا احترام کرنا۔ عام زندگی میں شاعری سے کام نہ لینا۔ صرف
مزاح کی کتابیں پڑھنا۔ نثر کی کتابوں سے دور بھاگنا ان کا روزمرہ ہے۔

(۳)

گویا یہ مضمون ناصر کاظمی کی شخصیت پر نہیں بلکہ شخصیت کے پس منظر
میں ان کی شاعری پر تبصرہ ہے — میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ اردو
میں ایسے ہی تبصرے لکھے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں (قدرے حمایت
کے ساتھ) اسے بھی اسی کتاب میں پیش کر رہا ہوں — میری خواہش ہے

کرنوں کی پرکھ کے ساتھ شخصیت بھی برابر ابھرتی چلی جائے
یہ میری صرف خواہش ہے۔ دعویٰ نہ شخصیت نگاری کا ہے اور نہ
نقادانہ سوجھ بوجھ کا۔

شب بیداری بھی کئی ہنگاموں کا باعث بنتی ہے۔ مجھے پہلے بھی جب ایک بار نیند نہیں آئی تھی تو میں نے شخصیات پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ جن سے میری راتیں تو کٹ گئیں لیکن دوسروں کا وقت ضائع ہوا۔ آج بھی نیند آنے کا نام نہیں لیتی۔ دو بار بستر سے اٹھ چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ جب اٹھا تھا تو چھت کی طرف منہ کر کے اپنی ذات سے لے کر ساری کائنات تک کے متعلق سوچتا رہا۔ اب دوسری بار اٹھا ہوں تو مجبوراً لکھنے کا ارادہ ہو گیا ہے اور ماحول یہ ہے کہ باہر زور کی بارش ہو رہی ہے۔ اتنی زور کی کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی خوفناک اور قیامت خیز بارش نہیں دیکھی۔ حالانکہ میں نے اکثر رات کو بارش کے لیے دعائیں مانگی ہیں۔ اس لیے کہ رات کی بارش میں جو سحر آگیں ترنم ہوتا ہے وہ میرے لیے دل اور روح کی تسکین کا موجب بنتا ہے لیکن اس بارش نے تو دہلا دہلا دیا ہے۔

اس وقت اتفاق سے میرے پاس ناصر کاظمی کا مجموعۂ کلام "برگِ نے" پڑا ہے۔

سوچتا ہوں اسی پہ اپنے خیالات قلمبند کر ڈالوں۔ ممکن ہے پھر کبھی مجھے ایسا ماحول نہ ملے جس میں یوں مجبور ہو کر لکھنا پڑے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ عرض کروں۔ آپ کو یہ یقین کر لینا چاہیے کہ میں کوئی نقّاد نہیں ہوں۔ اس لیے میری تحریر میں نقّادانہ تجربات کو نہ ڈھونڈھا جائے۔ اور نہ میری کسی بات پر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بہ حرف قطعی ہے۔ ویسے بھی حرف بہ حرف صحیح لکھنے والا تو آج تک کوئی پیدا ہی نہیں ہُوا۔ اسی عجز کے ساتھ، اب میں اپنی نقّادانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہوں۔ خدا عزّت رکھے۔

پہلی تنقیدی نظر میں نے اس کتاب پر یوں ڈالی ہے کہ اس کتاب کی قیمت تین روپے ہے اور اسے مکتبۂ کارواں لاہور نے چھاپا ہے۔

لیجیے اب اتنے بڑے تنقیدی فیصلے کے بعد کچھ مزید کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی۔ پھر بھی اگر مجھے کچھ اور کہنا ہی ہے تو یہ عرض کروں گا کہ اس کتاب کا مصنّف میرا دوست ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جتنی کام کی باتیں ہو سکتی تھیں، وہ تو اس کتاب کے بارے میں کہہ چکا ہوں۔ پھر بھی بعضوں کے نزدیک تفصیل بڑی ضروری چیز ہے۔ اس لیے اس فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، ورنہ ناصر صاحب

ہی کہیں گے۔ "بھائی! آپ نے تو مجھے رُلا دیا۔"

نئی نسل کے غزل گو شعرا میں ناصر کاظمی کا مقام بڑا نمایاں ہے! اور وہ نمایاں مقام اس لیے ہے کہ کل تین چار افراد ہی کا نام نئی نسل ہے۔ کچھ عرصہ سے انہی حضرات نے چائے کی میز پر گفتگو شروع کر رکھی ہے ـــــ پہلے تو انھوں نے غالبؔ کو چائے کی میز پر بیٹھ کر چسکیوں میں اُڑا دیا تھا۔ پھر ملک الشعرا میرؔ پر انھوں نے گفتگو کی اور اس گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ جیسے میرؔ و غالبؔ انہی کے مشوروں سے شعر کہتے تھے ورنہ وہ اصل میں کچھ نہ تھے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اصل میں کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ اگر ناصر کاظمی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی شاعری پر انہی دونوں شاعروں ـــــ میرؔ و غالبؔ ـــــ کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ میرؔ کا زیادہ اور غالبؔ کا کم' ان کے کلام میں جو بھولپن اور سادگی ہے وہ تو انھوں نے میرؔ سے لی اور جو بانکپن اور تیور ہیں وہ کچھ کچھ غالبؔ کے ہیں۔

یہاں ناصر کاظمی کی تھوڑی سی تعریف کرنے کو بھی جی چاہ رہا ہے کہ انھوں نے میرؔ کے رنگِ کلام کو موجودہ ماحول میں ڈھالنے اور اسے موجودہ تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سر توڑ کوشش کی ہے۔ خدانخواستہ اس سے میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ یہ میرؔ سے شاعرانہ عظمت میں بازی لے گئے ہیں بلکہ صرف یہ کہ انھوں نے میرؔ کے رنگِ کلام کو موجودہ تقاضوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے

اور ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ یہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ویسے تو یہ غالبؔ کے سے انداز میں بھی سوچتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ لیکن وہ انہیں زیادہ راس نہیں آیا اس لیے کہ غالبؔ ہی ایک ایسا شاعر ہے جو کسی کو اپنے پاس تک پھٹکنے نہیں دیتا۔ میرؔ بیچارے سادہ تھے اس لیے وہ ان کے ہتھے چڑھ گئے۔

ان کے مجموعۂ کلام میں جو سب سے آخری شعر ہے اس پر بدقسمتی سے بری سب سے پہلے نظر پڑ گئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

یہ شعر اگر ناصرؔ صاحب ستر، بہتر برس کی عمر میں جا کر کہتے تو بات ضرور بنتی لیکن انھوں نے تو یہ شعر لڑکپن ہی میں کہہ ڈالا ہے۔ اس لیے اس پر کون کان دھرے گا۔ پھر یہ ایک آدھ ہی ایسا شعر کہہ کر چپ ہو جاتے تو شاید نوٹس بھی نہ لیا جاتا۔ انھوں نے تو اس کے علاوہ بھی کچھ کہا ہے۔ اگر آپ سننا چاہیں تو میں آپ کی خدمت میں اور اشعار بھی پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً ؎

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

روج پہ ہے مرا دردان دنوں ناصر
ری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز

یہ بات کسی حد تک ضرور صحیح ہے اس لیے کہ انھوں نے یا تو ساری ساری رات سڑکوں پر گھوم کر گذار دی ہے یا پھر متقدمین کو پڑھا ہے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ وہ اتنا بڑا دعویٰ کرتے ہوئے کچھ تو سوچتے، اور اگر یہ مان بھی لیں کہ ان کے یہ تمام دعوے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پھر بھی ان کا کلام مایوس نہیں کرتا بلکہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور یہ انھی روایات کا بہ قدرِ ضرورت لحاظ بھی رکھتے ہیں بلکہ انھوں نے تو بعض جگہ متقدمین کے الفاظ و اسلوب تک کو اپنے اشعار میں سمونا چاہا ہے۔ جس کی آج

چنداں ضرورت بھی نہ تھی جیسے ؎

بں ہاتھ نہیں انھیں لگایا
ــــے بے کسی! گواہ رہنا

یک بہ یک آکے دکھا دو جھلکی
یوں پھراتے ہو پریشان سے مجھے

آؤ ناصر کوئی غزل چھیڑیں
ی بہل جائے گا اسے کچھ تو

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

آخری شعر کی تو پوری کی پوری غزل ہی میر کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کی شاعری کے اس رُخ پر بات ہی نہ کی جائے ورنہ وہ یہ کہہ دیں گے کہ آخر اس میں عیب کی کوئی بات ہی کونسی ہے۔ انصاف کے ساتھ دیکھا جائے تو واقعی اس میں عیب کی کوئی بات نظر نہ آئے گی بلکہ الٹا یہ احساس ہوگا کہ یہ شاعر ہو کر پڑھا لکھا ہے۔ ویسے کسی نے ان پر میر خولیا کے سلسلے میں ایک پھبتی بھی تو کسی تھی کہ

شعر ہوتے ہیں میر کے ناظم لفظ کچھ دائیں بائیں کرتا ہے

یہ پھبتی ان کے حق میں بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس لیے کہ میر کے شعروں کو دائیں بائیں کر دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، یہ لاکھ میرے دوست سہی پھر بھی یہ اس پھبتی کے حق دار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ میر تو وہ شاعر ہے جسے غالب ایسے نک چڑھے بھی نظرانداز نہ کر سکے۔ بلکہ تعریف ہی کرتے بنی۔

ابھی ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ یہ حضرت اقبال کے سلسلے میں بھی ویسی ہی چائے کی میز پر ایک گفتگو ضرور کریں گے۔ کیونکہ ان کے ہاں اقبال کا بھی کچھ اسلوب مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

اے منتظرِ طلوعِ فردا  بدلے گا جہانِ مرغ و ماہی
پھر خاک نشیں اٹھائیں گے سر  مٹنے کو ہے نازِ کج کلاہی
پھر اہلِ وفا کا دور ہوگا  ٹوٹے گا طلسمِ کم نگاہی

آئینِ جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

میں نے ناصر کاظمی کی شاعری پر کچھ عرض کرتے ہوئے ان کا مقابلہ میر غالب اور اقبال سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ان شعراء کے ساتھ ناصر صاحب کا نام لینے کے لیے وضو کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ان ساری باتوں کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ اس کے بغیر ان کے کلام کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ ابھی تک اپنا کوئی منفرد رنگ نہیں بنا سکے جسے پڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے کہ یہ ناصر کاظمی کا کلام ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے ایسی غزلیں اور ایسے اشعار کہے ہیں جو دماغ کو متاثر کریں یا نہ کریں دل پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں اور وہ وقت آنے والا ہے جب یہ دونوں صورتوں میں کامیاب ہوں گے۔ بھلا ایسے ایسے شعر کہنے والا شاعر معمولی شاعر ہو سکتا ہے:

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

خیال آ گیا مایوس رہگزاروں کا
پلٹ کے آ گئے منزل سے ترے دیوانے

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گذرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی
میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

میں رو رہا تھا محبت کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں دانغ میں گل کے

رنگ، کھلے صحرا کی دھوپ
زلف، گھنے جنگل کی رات

اور

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرس گل اُداس کر کے مجھے

سازِ ہستی کی صدا، غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا، غور سے سُن

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

پوری کی پوری غزلیں مرصّع ہیں اور ان میں مشاقی کی شان پوری آن بان کے ساتھ جھلکتی ہے اور میں نے تو ان غزلوں کو کئی کئی بار پڑھا ہے اور ہر بار ایک نیا لطف محسوس کیا ہے۔

ان کے ہاں کئی بھرتی کے اشعار بھی ہیں ممکن ہے یہی ان کے نزدیک شاہکار کا درجہ رکھتے ہوں اور میں نے انھیں خواہ مخواہ بھرتی کے اشعار کہہ دیا ہو۔ ان میں سے چند ایک آپ بھی سُن لیں ۔۔

پھر جاڑے کی رُت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات

پیار کی ریت نرالی ہے
کوئی کرے اور کوئی بھرے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پہ ہے جہاں تھا پہلے

ان کے بعض اشعار میں فنّی کمزوریاں بھی ہیں۔ چونکہ مجھے ان کے بارے میں یقین نہیں ـــ اس لیے ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر میں نے اس باب میں کچھ کہا تو ڈر ہے ناصر صاحب بہ آسانی اپنا شعر کسی اُستاد کے نام سے سند کے طور پر پیش کر کے مجھے مطمئن نہ کر دیں۔

ان دنوں ہر نقّاد ہر کتاب پر تنقید کرتے ہوئے یہ ضرور دیکھتا ہے کہ مصنّف نے فسادات کے بارے میں بھی کچھ کہا ہے کہ نہیں۔ خواہ وہ کتاب ریاضی پر ہی کیوں نہ ہو، اگر کچھ کہا ہو تو اس کا ذکر لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے بھی اس کا ذکر کرنا اپنے پہ فرض کر لیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ناصر صاحب کے

دل و دماغ پر فسادات کا بڑا شدید اثر ہے اور وہ اثر ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ کہیئے تو چند اشعار پیش کر دوں ؎

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ — یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصرؔ — وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

شہر در شہر گھر جلائے گئے — یوں بھی جشن طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی — اک طرف آشیاں جلائے گئے
کیا کہوں کس طرح سرِ بازار — عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے
آہ! وہ خلوتوں کے سرمائے — مجمع عام میں لٹائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصرؔ
خار و خس کی طرح بہائے گئے

کہیں آگ اور لاشوں کے انبار
بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

ان کے ہاں سوز اور تڑپ کے علاوہ حزن و ملال کی جو کار فرمائی نظر آتی ہے وہ انہی حالات و حادثات کی بدولت ہے اور ان کے کلام میں جو گہرائی اور گیرائی ہے وہ بھی کچھ انہی حالات کی رہینِ منت ہے۔ ورنہ یہ

آسودہ حال شاعر ہزاروں راتیں سڑکوں پر گھوم گھوم کر نہ گذار دیتا اور ایسی ایسی اثر آفریں غزلیں نہ کہہ پاتا :

دن ڈھلا رات پھر آگئی سو رہو سو رہو
منزلوں چھا گئی خامشی سو رہو سو رہو
چاندنی اور دھوئیں کے سوا دور تک کچھ نہیں
سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو
سست رفتار تارے بھی آنکھیں جھپکنے لگے
غم کے مارو گھڑی دو گھڑی سو رہو سو رہو
منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل دیئے
دور ہے صبح روشن ابھی سو رہو سو رہو

اسی مضمون میں اس شعر کے تیور بھی ملاحظہ ہوں ؎

کبھی فرصت ملے تو پچھلے پہر
شب گزیدوں کی انجمن میں آ

اگر بدقسمتی سے میرے یہ دوست نہ ہوتے تو میں اوّل تو ان کی شاعری پر تبصرہ ہی نہ کرتا اور اگر کرتا تو صرف ان کی تعریف ہی کرتا۔ اس لیے کہ ان کے کلام کا مجھ پر بڑا اثر ہے۔ چونکہ یہ میرے دوست ہیں اس لیے میں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ ان کے خلاف بھی مجھے ہی سب کچھ کہنے کا حق ہے

یہی وجہ ہے کہ مجھے جہاں جہاں مخالفت کا موقع مل سکتا تھا اس سے میں نے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں جو ریاضت اور سوچ کر کہنے کی آرزو ہے وہ ایک نہ ایک دن انھیں اچھے شاعروں میں جگہ دے گی۔ اب بھی انھوں نے بہ حیثیت مجموعی کام ہی کے شعر کہے ہیں۔ یوں تو اب تک بے شمار شاعر آئے اور گئے۔ لیکن ان کا شمار آنے والے شعرا ہی میں ہوگا۔ جانے والے شعرا میں نہ ہوگا۔

اب آخر میں مجھے ان سے ایک اور ویسی ہی بات کہنی ہے کہ یہ دیکھا دیکھی جس ادبی سیاست میں قدم رکھ رہے ہیں وہ نہ جانے ان کے ابھرنے کا باعث ہوگی یا ان کے پھسلنے کا۔ بہر حال اب میں اس لیے چپ ہو جانا چاہتا ہوں کہ جیسے ناصر صاحب مجھ سے کہہ رہے ہوں ؎

قہر سے دیکھ نہ ہر آن مجھے
آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے